مثنوی
رموز العارفین
تصنیف میر حسن دہلوی
تصحیح
مقدمہ تاریخی و انتقادی
نوشتہ سید احمد اللہ قادری
سنہ ۱۳۵۲ھ
مطبوعہ شمس الاسلام پریس حیدرآباد دکن
دو روپے

مثنوی

رموز العارفین

تصنیف

میر حسن دہلوی

مع

مقدمہ

نوشتہ

سید احمد اللہ قادری

بگرامی خدمت

عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر بالقابہٗ

ایم۔ اے دارالعلوم کیمبرج۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ میڈل ٹیمپل

معتمد سررشتۂ عدالت و کوتوالی و امور عامہ

ممالک محروسہ سرکار عالی

گذرانیدہ

سید احمد اللہ قادری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میر حسن دہلوی اُن باکمال شعرا سے ہیں جن کا نام اردو شاعری میں ہمیشہ یادگار رہیگا ان کے آبا و اجداد ہرات کے سادات عظام سے تھے۔ جد امجد میر امامی نے شاہ جہاں بادشاہ (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء تا ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء) کے اخیر عہد میں ولایت سے آکر دہلی میں سکونت اختیار کی اور ان کی اولاد نے اسی خطۂ پاک میں نشو و نما حاصل کیا۔

میر حسن کے والد میر غلام حسین۔ میر عزیز اللہ کے فرزند اور میر امامی کے پوتے تھے میر غلام حسین فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے پرگو اور ظریف الطبع شاعر تھے بقول میر حسن ان کی کوئی غزل ہزل سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ اس رعایت سے انھوں نے اپنا تخلص بھی ضاحک رکھا تھا۔ میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا کے معاصر تھے۔ ان میں اور مرزا سودا میں ہمیشہ چشمک رہا کرتی تھی چنانچہ ایک مرتبہ میر ضاحک نے مرزا صاحب کی ہجو کہی اسکے بعد مرزا نے ایک طویل ہجویہ مثنوی اُنکے جواب میں لکھی۔ یہ ہجو مرزا کے کلیات میں اس وقت بھی موجود ہے[1]

---

[1] کلیات سودا مطبع لکھنؤ ۱۸۸۰ء صفحہ ۱۹۴

میر حسن کا اصلی نام میر غلام حسن ہے۔ یہ سنہ ۱۱۴۰ھ / ۲۷-۱۷۲۶ء یا اسی کے لگ بھگ پرانی دہلی کے محلہ سید واڑہ میں پیدا ہوئے[1] نواب علی ابراہیم خان کے تذکرہ گلزار ابراہیم[2] سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں انھوں نے اپنے والد سے درسی کتابیں پڑھیں اور انہی کے فیض تربیت سے شعر و سخن کا شوق ہوا۔ ابتدا میں اپنا کلام اپنے والد ہی کو دکھایا کرتے تھے۔ جب مشق بڑھ گئی تو حضرت خواجہ میر دردؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ خواجہ صاحب کی نکتہ سنج اور علم نواز طبیعت کا ان پر گہرا اثر ہوا اُن ہی کے فیض نے شاعری کا صحیح مذاق پیدا کر دیا اور اسی زمانہ سے ان کے کلام میں پختگی آئی۔

احمد شاہ ابدالی کی یورش اور مرہٹوں کی تباہ کاریوں کے باعث دہلی اجڑ گئی تو یہاں کے اکثر ارباب کمال نے ترک وطن کر کے لکھنؤ اور بنگالہ کا رخ کیا۔ اس شہر آشوب گردی میں میر حسن اور ان کے والد میر غلام حسین ضاحک بھی مجبوراً دہلی سے لکھنؤ چلے آئے ترک وطن کے وقت میر حسن کا عین شباب تھا۔ جس وقت دہلی سے روانہ ہونے لگے تو اپنے اُستاد حضرت خواجہ میر دردؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ذیل کی رباعی پیش کی اور ان سے نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ وطن کو خیرباد کہنے کی اجازت چاہی۔

جاناں ز تو امید نگاہے داریم — امید نگاہے ز تو گاہے داریم
ما کشتۂ چشم سرمہ سایت ہستیم — نے نالہ و نے فغاں نہ آہے داریم

میر حسن دہلی سے نکل کر کئی منازل طے کرنے کے بعد بھرت پور کے علاقہ میں آکر دیگ میں چند ماہ مقیم رہے اور یہاں سے حضرت شاہ مدار کی چھڑیوں کے ہمراہ مکن پور پہنچے اور مکن پور سے لکھنؤ میں وارد ہوئے۔ یہ زمانہ نواب شجاع الدولہ بہادر

---

[1] سید نصیر حسین خاں خیال نے اپنے مضمون "میر حسن" میں ان کا سنہ ولادت ۱۱۲۱ھ لکھا ہے۔ لیکن کوئی سند پیش نہیں کی (اولڈ بائے حیدرآباد جلد ۲ صفحہ ۳)

[2] تذکرہ گلزار ابراہیم سنہ ۹۶-۱۱۹۵ھ میں تالیف ہوا

(۱۱۶۷ھ تا ۱۱۸۹ھ) کی حکومت کا تھا۔ اور فیض آباد ان کی راجدھانی تھی۔ نواب سالار جنگ بہادر دربار اودھ کے امرائے کبار سے تھے اُنکے فرزند میر نوازش علی خاں المخاطب بہ نواب سردار جنگ بہادر کو شعر و سخن کا خاص مذاق تھا۔ اور وہ بڑے قدرشناس تھے۔ چنانچہ میر حسن لکھنؤ سے فیض آباد آکر نواب سالار جنگ بہادر کی سرکار میں متوسل ہو گئے اور نواب سردار جنگ بہادر کی مصاحبت میں دس گیارہ سال بسر کیے۔

اسی زمانہ میں میر ضیاء الدین ضیا جو اردو کے نامور شاعر ہوئے ہیں کچھ عرصہ سے فیض آباد میں مقیم تھے۔ میر حسن نے فیض آباد آنے کے بعد ان سے اپنے کلام میں اصلاح لینی شروع کی۔ تھوڑی مدت کے بعد میر ضیا یہاں سے عظیم آباد جا کر مہاراجہ شتاب رائے کے فرزند راجہ کلیان سنگھ کے متوسل ہوئے۔ جس کے باعث سلسلہ شاگردی منقطع ہوگیا۔

میر حسن نے اپنے تذکرہ میں میر ضیا سے تلمذ حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ میر ضیا کا رنگ تغزل ان سے نبھ نہ سکا تو میر تقی میرؔ مرزا سوداؔ اور خواجہ میر دردؔ کی اتباع میں کہنا شروع کیا۔

> اصلاح سخن از میر ضیا سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرز او شان از من کما حقہٗ سرانجام نیافت بر قدم دیگر بزرگان مثل خواجہ میر دردؔ و مرزا رفیع السوداؔ و میر تقی میرؔ پیروی نمودم[۱]۔

قدرت اللہ خاں قاسم کے تذکرہ مجموعۂ نغز سے واضح ہوتا ہے کہ میر حسن کو میر سوز کا رنگ بہت مرغوب[۲] تھا۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ ان کی اکثر غزلیں سوزؔ کے خاص رنگ میں پائی جاتی ہیں۔

میر ضیا جب عظیم آباد چلے گئے تو اس کے کچھ عرصہ بعد مرزا سوداؔ اپنے قدردان نواب احمد یار خاں بہادر غالب جنگ کے فوت ہو جانے سے (۱۱۸۵ھ) فرخ آباد کو خیرباد کہہ کر

۱؎ تذکرہ میر حسن صفحہ ۸۵ ۲؎ مجموعہ نغز مطبوعہ صفحہ ۲۰۳

فیض آباد چلے آئے اور نواب شجاع الدولہ بہادر کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ اس موقع سے میر حسن نے فائدہ اٹھایا اور اپنا کلام مرزا سودا کو دکھانے لگے۔

میر حسن نے اپنے آخری ایام میں مشہور فارسی گو شاعر مرزا قتیل سے بھی مشورہ سخن کیا تھا[1] اور ان سے اپنے کلام میں کبھی کبھی اصلاح لی۔ خاصکر مثنوی سحر البیان کی نظر ثانی میں مرزا قتیل نے زیادہ حصہ لیا۔

> میر حسن در تمام عمر خود در مثنوی کہ زبان اردو ہزار پانصد بیت نخواہد بود صرف کرد۔ مرزا قتیل بسیار اصلاح دادہ[2] اند۔

نواب شجاع الدولہ بہادر کا ۱۱۸۹ھ ۱۷۷۵ء میں انتقال ہوا۔ ان کی جگہ نواب آصف الدولہ بہادر تخت نشین ہوئے۔ نواب آصف الدولہ نے فیض آباد کی بجائے لکھنو کو اپنا دار الحکومت قرار دیا۔ اس تغیّر سے لکھنو پھر ایک مرتبہ علماء و فضلاء کا مرکز و مرجع بن گیا اور تمام ارباب کمال دُور دُور سے کھنچکر لکھنو میں چلے آئے۔ میر حسن بھی بیداری بخت کی امید میں فیض آباد سے لکھنو میں آگئے۔ رفتہ رفتہ بادشاہ تک رسائی بھی ہوگئی۔ اور بادشاہ کو مہربان دیکھ کر مثنوی سحر البیان لکھنی شروع کی ۱۱۹۹ھ ۱۷۸۴ء میں ختم کرکے اس کو نواب آصف الدولہ بہادر کے ملاحظہ میں پیش کیا۔ اس کے بعد یہ بہت کم عرصہ زندہ رہے۔ آخر ماہ ذیحجہ میں بیمار ہوکر

---

[1] مجموعہ تحقیقات علمیہ ص ۱۳۱

[2] منشی سدا سکھ نیاز دہلوی نے ۱۲۳۲ھ میں تنبیہ الجاہلین کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کے آٹھ مقالے ہیں مقالۂ اول میں ہندستان کے مختلف مذاہب کا ذکر۔ مقالہ دوم۔ شرح اقوام برہمنہ و راجپوتانہ وغیرہ مقالہ سوم۔ بحث طہارت اور دیگر رسوم وغیرہ مقالہ چہارم تنبیہ فرقہ۔ مقالہ پنجم۔ ذکر روایات غریب دیدہ و شنیدہ مقالہ ششم۔ در سخن ہائے عجیب و حالات حیوانات بری و بحری۔ مقالہ ہفتم۔ احوال زمان ماضی۔ مقالہ ہشتم۔ در بعضے علوم کہ فارسیان از اں اطلاع ندارند۔ آٹھویں مقالہ کے آخر میں اُردو شاعری کے متعلق نہایت کارآمد معلومات ہیں۔ اس کتاب کے مصنف سے مرزا رفیع سودا، مرزا قتیل دہلوی سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ شیخ علی حزیں، مرزا مظہر جانجاناں، محمد فاخر مکین۔ خواجہ میر درد وغیرہ سے بھی ملاقات تھی۔ اس میں جو بات قابل توجہ ہے اور جس سے ایک اہم تاریخی مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے یہ کہ میر حسن نے مرزا قتیل دہلوی سے اپنے کلام میں اصلاح لی۔ مزید تفصیل کے لیے رسالہ تحقیقات علمیہ دیکھا جائے۔

غرۂ محرم ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء کو ساٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا لکھنؤ کے محلہ مفتی گنج میں جہاں نواب قاسم علیخاں کا باغیچہ واقع ہے اس کے عقبی حصہ میں سپرد خاک ہوئے۔ مشہور شاعر مصحفی سے ان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور ان کی وفات پر انہوں نے حسب ذیل تاریخ لکھی۔

چوں حسن آں بلبل خوش داستاں | رُو۔ ازیں گلزار رنگ و بو بتافت
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی | شاعر شیریں بیاں۔ تاریخ یافت

مرزا علی لطف نے گلشن ہند میں ان کا سن وفات ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء تحریر کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

علی ابراہیم خاں نے گلزار ابراہیم میں اخلاق اور عادات کی نسبت لکھا ہے کہ بہت سنجیدہ اور خوش خلق آدمی تھے، انھوں نے کبھی معیوب کلام نہیں کہا۔

میر حسن عربی سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ البتہ اُردو اور فارسی میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ تمام تذکرہ نویسوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ہندوستان کے شعراء کی تصانیف میں کسی کی کتاب کو وہ قبول عام نصیب نہیں ہوا۔ جیسا کہ میر حسن کی مثنوی سحرالبیان نے شہرت دوام حاصل کی اور اس سے ان کی اعلیٰ قابلیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان کو مثنوی لکھنے میں حقیقتاً بڑا ہی کمال حاصل تھا۔ غزل کہنے میں میر سوز اور میر تقی میر کے دوش بدوش ہیں۔ ان کی غزلیں سادگی و دلفریبی اور عاشقانہ رنگ میں وہی لطف دکھاتی ہیں جو سوز اور میر کی مختص خصوصیات سے ہیں۔

انھوں نے مرثیے، رباعیات اور قصائد بھی کہے ہیں، یہ اپنے عصر کے بہترین قصیدہ گو تھے۔ مرزا رفیع سودا کے انتقال کے بعد لکھنؤ میں ان سے اچھا قصیدہ کہنے والا نہیں تھا۔

میر حسن کے چار بیٹے تھے، جن میں تین شاعر ہوئے، میر مستحسن خلیق، میر محسن محسن میر احسن خلق عام طور پر مشہور اور اساتذہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ پہلے دو لڑکے

مرزا محمد تقی کی سرکار سے وابستہ تھے۔ میر حسن خلق نواب ناظر داراب علی خاں کی خدمت میں رہتے تھے۔ خلیق کے بیٹے میر انیس تھے جو مرثیہ نگاری میں یکتائے زمانہ تصور کئے جاتے ہیں۔ انیس کے بیٹے میر نفیس تھے۔ یہ اعزاز میر حسن کے خاندان کو بطور ورثہ حاصل ہوا تھا۔ ان کی سپوت اولاد کے مقابلہ میں آج اُردو کا کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھی مداحی حسین کا دعویٰ پیش نہیں کر سکتا۔

میر حسن نے خود لکھا ہے کہ میں نے جو شاعری شروع کی ہے، وہ آج کل کی نہیں بلکہ میرا آبائی فن ہے[1]۔ میر حسن کے پردادا میر امامی جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے ہفت قلم اور بڑے پایہ کے شاعر تھے۔ میر انیس نے اپنے ایک مرثیہ میں یہ مصرعہ لکھ کر آبائی مداح حسین ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

پانچویں پُشت ہے شبیر کی مدّاحی میں

لیکن حقیقت میں ان کی چھٹی پشت تھی۔ چنانچہ ان کے بیٹے میر نفیس نے وضاحت فرما دی ہے۔

شمشیر فصاحت پہ ہے یہ ساتواں صیقل

اس موقع پر خاندان میر حسن کا ایک شجرہ پیش کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ صرف ہندوستان میں میر حسن کا ہی ایک ایسا خوش نصیب خاندان ہے جس کی اولاد میں شاعری پشت ہا پشت سے اب تک بطور میراث چلی آتی ہے۔

---

[1] پس ایں عاجز سخن را سررشتہ شاعری اجدادی است نہ امروزی۔ تذکرہ شعرائے اردو صفحہ ۶۰

میر امامی
|
میر عزیز اللہ
|
میر ضاحک
|
میر حسن

خلق — خلیق — محسن

(خلیق) ← میر انیس — میر مونس — میر انس

(میر انیس) ← نفیس — سلیس — میر عسکری رئیس

(سلیس) ← جلیس

(میر انس) ← میر وحید

(نفیس) ← دولھا صاحب عروج — دختر

(دختر) ← عارف

میر حسن نے کئی تصانیف اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں جن میں تذکرہ شعرائے اردو، کلیات، مثنوی گلزار ارم، مثنوی سحر البیان خاص طور پر مشہور ہیں۔

تذکرہ شعرائے اردو | یہ تذکرہ میر حسن نے ۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء یا ۱۱۹۲ھ / ۱۷۷۸ء کے ابتدائی ایام میں بمقام فیض آباد نواب آصف الدولہ کے عہد میں تالیف کیا۔[1]

---

[1] مسٹر رام بابو صاحب سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں تذکرہ کا سنہ تصنیف ۱۱۹۴ھ قرار دیا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی نے مقدمہ میر حسن میں اس کا سنہ تالیف ۱۱۸۸ھ و ۱۱۹۲ھ تحریر فرمایا ہے۔ سکسینہ صاحب مولانا شیروانی کی تحریر سے واقف ہیں۔ ہم نے جہاں تک میر حسن کی تصانیف کا مطالعہ کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ (بقیہ برصفحہ ۸)

اس سے قبل اردو شاعری سے متعلق جس قدر تذکرے لکھے گئے ان کا زمانہ بارہویں صدی ہجری کا نصف آخر ہے اس موضوع پر سب سے پہلا تذکرہ مشہور شاعر میر تقی میر کا نکات الشعرا ہے جو سنہ ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۱ء) میں تصنیف ہوا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد سنہ ۱۱۶۶ھ میں فتح علی گردیزی نے اپنا تذکرہ ریختہ گویان لکھا۔ اس کے دو سال بعد سنہ ۱۱۶۸ھ (۱۷۵۴ء) میں قیام الدین قائم نے مخزن نکات کو تالیف کیا۔ مخزن نکات کے تقریباً سات سال بعد سنہ ۱۱۷۵ھ (۱۷۶۱ء) میں لچھمی نارائن شفیق کا تذکرہ چمنستان شعرا تمام ہوا۔ یہ چاروں تذکرے اردو شاعری کی تاریخ کے اساسِ اولین ہیں پہلے تین تذکروں میں کم و بیش ایک سو تیس شعراء کا حال ہے اور شفیق نے اپنے تذکرے میں ۲۰۵ شعراء کے حالات جمع کیے ہیں۔

چمنستان شعراء کے تقریباً سولہ سال بعد میر حسن نے اپنا تذکرہ لکھا اس تذکرے میں تین سو شعراء کا حال ہے اور تذکرہ کا بہت بڑا حصہ مصنف کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں خصوصیت یہ ہے کہ یہ اس زمانہ میں لکھا گیا جب شعرائے اردو کا دور سوم ختم ہو چکا تھا اور دور چہارم کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ میر حسن کی عمر اس وقت تینتالیس سال کی ہو چکی تھی اور وہ بہت سے شعراء سے بذاتِ خود واقف تھے اس لحاظ سے اس تذکرہ کا بہت بڑا حصہ مصنف کے چشم دید واقعات پر مبنی ہے۔

اس کی تقسیم و ترتیب میں بھی خاص سلیقہ پیش نظر رکھا گیا ہے۔ تین دور متقدمین متوسطین اور متاخرین کے ردیف وار حروف تہجی کے حساب سے قائم کیے ہیں۔

دور متقدمین میں فرخ سیر سے پہلے کے شعراء کا حال اور سخن ریختہ کے شمالی ہند میں مروج ہونے کا تذکرہ ہے۔ دور متوسطین فرخ سیر کے آخری عہد سے محمد شاہ کے ابتدائی زمانہ پر ختم ہوتا ہے۔ دور متاخرین میں محمد شاہ کے زمانہ سے عہد تصنیف تک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷) تذکرہ مثنوی گلزار ارم سے پہلے لکھا گیا تھا۔ مثنوی گلزار ارم سنہ ۱۱۹۲ھ میں تصنیف ہوئی اگر تذکرہ گلزار ارم کے بعد تالیف ہوتا تو ضرور تھا کہ میر حسن اپنے حالات میں مثنوی گلزار ارم کا بھی ذکر فرماتے جیسا کہ مثنوی رموز العارفین کا کیا ہے۔

شعرا کے حالات ہیں۔

یہ تذکرہ حقیقت میں ایک غیر معمولی ادبی یادگار ہے جس کی بدولت اردو کی ارتقائی تاریخ کے مطالعہ میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کو سنہ ۱۳۴۰ھ میں مولانا حبیب الرحمٰن خانصاحب شیروانی کے ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا۔

مولوی کریم الدین نے طبقات الشعرا میں لکھا کہ اس کی زبان ریختہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زبان فارسی میں تصنیف ہوا ہے۔

کلیات حسن ان کا ایک کلیات بہت ضخیم ہے جس میں تمام اقسام سخن مثلاً ترکیب بند۔ مخمس واسوخت مثلث (جس میں شعر پر تیسرا مصرع خواہ فارسی میں یا اُردو میں لگایا ہے) مثنوی، قطعات، مرثیے، رباعیات وغیرہ ہیں۔

میر حسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔

فقیر دریں مدت قریب ہفت ہزار بیت گفتہ باشد[1]

یہ بیان وفات سے دس سال اور مثنوی سحرالبیان کی تصنیف سے آٹھ سال قبل کا ہے۔ اس طول طویل مدت میں کلام میں خاصا اضافہ ہوتا رہا ہوگا۔ مثنوی سحرالبیان اور گلزار ارم کے اشعار اڑھائی ہزار سے متجاوز ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر مثنویاں، قصائد اور متفرق کلام ہے اگر ان تمام کو شمار کیا جائے تو اشعار کی تعداد دس گیارہ ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔

کلیات بہت نایاب ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ ہمارے واجب الاحترام بزرگ مولانا حبیب الرحمٰن خانصاحب شیروانی نواب صدر یار جنگ بہادر کے گرانمایہ کتب خانہ میں ہے۔ نواب نصیر حسین خاں خیال کے پاس بھی کلیات کا ایک نسخہ موجود ہے۔ چنانچہ کلیات حسن پر انھوں نے ایک سرسری مضمون حیدرآباد و لڈ بائے میں لکھا تھا۔

---

[1] تذکرہ شعرائے اُردو صفحہ ۷۸

مولانا عبدالحق بی۔اے معتمد انجمن ترقی اردو کے نایاب کتب خانہ میں کلیات کے دو مکمل نسخے ہیں۔

نواب صدر یار جنگ بہادر نے "کلیات حسن" پر ایک مبسوط مضمون "رسالہ ہندوستانی" بابتہ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں تحریر فرمایا، جس کا اقتباس ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

کلام کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱ ۔	غزلیات	
۲ ۔	فردیات	۴۰
۳ ۔	رباعیات	۱۵۴
۴ ۔	تضمین	۳
۵ ۔	مخمس	۱۴
۶ ۔	مسدس	۱
۷ ۔	واسوخت	۱
۸ ۔	مثلثات	۳۱۰
۹ ۔	قصائد	۷
۱۰ ۔	مثنویاں	۱۱

ایک تضمین میں مرزا صائب کی حسب ذیل غزل پر مصرعے لگائے ہیں۔

کل کے عالم نے تو کچھ مجھ میں نہیں چھوڑی تاب
باقی اب کیا ہے کہ جس کے لیے اے خانہ خراب
دلبریانہ دگر بر سر ناز آمدہ
از دل ما چہ بجا ماند کہ باز آمدہ

مسدس میں عظیم کشمیری کی ہجو ہے۔

واسوخت عام روش کے خلاف مثمن ہے اور ہر بند کے لئے مختلف فارسی شعراء کے اشعار انتخاب کیے ہیں۔

قصائد کی تفصیل یہ ہے:۔

قصیدۂ اول۔ الموسوم بہ لمعۂ نور امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں۔

قصیدۂ دوم۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کی منقبت میں۔

قصیدۂ سوم۔ نواب آصف الدولہ بہادر کی مدح میں۔

قصیدۂ چہارم۔ نواب سالار جنگ بہادر کی مدح میں۔

قصیدۂ پنجم۔ نواب آصف الدولہ کی مدح میں۔

قصیدۂ ششم۔ نواب جواہر علی خاں کی مدح میں۔

قصیدۂ ہفتم۔ نواب آدم علی خاں کی مدح میں۔

مثنویات گیارہ ہیں:۔

۱ ۔ رموز العارفین

۲ ۔ گلزار ارم

۳ ۔ سحر البیان

۴ ۔ جواہر علی خاں کے "قصر جواہر" کی مدح میں۔

۵ ۔ نواب آصف الدولہ بہادر کی شادی کے بیان میں۔

۶ ۔ میر حسن کے مکان کی ہجو میں۔

۷ ۔ نواب آصف الدولہ بہادر کے باورچیخانہ کی تعریف میں۔ اسکا نام خوان نعمت ہے۔

۸ ۔ جواہر علیخاں کی تہنیت عید کے بیان میں اسکا نام "عید کی تہنیت" ہے۔
"کہ ہے عید کی تہنیت اسکا نام"

۹ - فحش ہے۔

۱۰ - مذاقیہ ہے۔

۱۱ - فحش ہے۔

اخیر کی تین مثنویوں میں بھی چھوٹی حکایات مذکور ہیں۔

مثنوی گلزار ارم | ۱۱۹۲ھ میں تمام ہوئی ہے۔ گلزار ارم اس کا تاریخی نام ہے۔ جس سے ۱۱۹۲ھ برآمد ہوتے ہیں۔

اس میں مصنف نے اپنے سفر کا تذکرہ کیا ہے جو انہوں نے دہلی سے لکھنؤ آنے کے لیے اختیار کیا۔ اس سے ان کے حالات پر نہایت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ مثنوی کا خلاصہ یہ ہے کہ میر صاحب اپنے چند عزیز دوستوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے اور دہلی سے نکلکر سب سے پہلے چند ماہ ڈیگ میں مقیم رہے۔ اس کے بعد حضرت شاہ مدار کی چھڑیوں کے ہمراہ مکن پور گئے وہاں ایک عظیم الشان میلہ ہوا کرتا تھا۔ اس میں نہایت حسین و جمیل عورتیں بھی شریک ہوا کرتی تھیں، ان کے حسن و پوشاک کی بڑی تعریف کی ہے مثنوی کے آخر میں لکھنؤ کی مذمت اور فیض آباد کی ستائش ہے۔ یہاں تک کہ اُسے باغ فردوس سے تعبیر کیا ہے۔

گارسن ڈی تاسی، بلوم ہارٹ اور مولوی کریم الدین نے اس کو مثنوی سحر البیان کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔ مولانا آزاد کے زمانہ میں جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے یہ مثنوی کمیاب تھی لیکن ۱۹۰۸ء میں مخزن پریس لاہور میں چھپ جانے کے باعث اب عام طور پر مل جاتی ہے۔

مثنوی سحر البیان | یہ میر حسن کی سب میں آخری اور مایۂ ناز تصنیف ہے۔ اور اس قدر

مشہور و مقبول ہوئی کہ اتنی شہرت و قبولیت کسی کی کتاب کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔
قصۂ سحر البیان ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء میں بعہد نواب آصف الدولہ بہادر ختم ہوا اور انہی کے لئے لکھا گیا۔ اس میں شہزادہ بےنظیر اور شاہزادی بدر منیر کے حسن و عشق کا افسانہ ہے۔ ضمنی طور پر بہت سی حکایات بھی آگئی ہیں جس سے قدیم زمانہ کے رسم و رواج شادی بیاہ و پوشاک وغیرہ کا پتہ چلتا ہے۔

مثنوی اس قدر صاف اور سلیس ہے کہ اس کا ہر مصرع لاجواب اور زور بیان و طرز ادا کے اعتبار سے غیر معمولی درجہ رکھتا ہے۔ اس میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ دلی کیفیات اور جذبات نہایت دلنشین پیرایہ میں بیان کیے ہیں۔ مولانا آزاد مرحوم نے آبحیات میں نہایت تعجب سے لکھا کہ سحر البیان کو تصنیف ہو کر آج ڈیڑھ سو برس کا زمانہ ہوا لیکن اس کا مصنف سو برس بعد کی زبان سے واقف اور یہ وہی زبان لکھتا ہے جو آج ہم کہتے اور لکھتے ہیں۔ جس وقت کہ یہ مثنوی تصنیف ہوئی تھی بہت سے الفاظ ایسے بھی تھے جو اب متروک ہو گئے۔ لیکن مصنف نے وہ الفاظ اپنی کتاب میں کہیں نہیں آنے دیے اور یہ مصنف کا سب سے بڑا کمال تھا۔

شمس العلما مولانا امداد امام نے بہارستان سخن میں سحر البیان پر ایک بسیط تبصرہ تحریر کیا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"ان کی مثنوی ایک نہایت حیرت انگیز تصنیف ہے۔ اس مثنوی میں شاعری کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ اردو میں تو یقیناً ایسی کوئی مثنوی نہیں لکھی گئی ہے فقیر کی دانست میں فارسی اور اردو کے کسی مثنوی نگار نے میر حسن کے برابر فطرت نگاری کا لطف نہیں دکھلایا ہے حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے اس مثنوی کو حکیم کی نگاہ سے نہ دیکھا اس نے گویا شاعری کا لطف ہی نہیں اٹھایا۔ اس مثنوی سے بے خبر رہنا ویسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص سب کتابیں پڑھ ڈالے اور شکسپیر، الف لیلہ اور گلستان سعدی کے مطالعہ اور ملاحظہ سے

محروم رہ جائے۔ کوئی صاحبِ مذاق ایسا نہیں ہے جو اس مثنوی سے لطف کثیر نہ اٹھائے۔ اور زبان اُردو سے باخبر ہو کر اس سے بے خبر رہنا پسند کرے۔
یہ مثنوی اخلاقی، تمدنی اور مذہبی پہلوؤں سے پر از فوائد ہے۔ اس مثنوی کی قدردانی سوائے حکیم کے کسی سے ہو نہیں سکتی۔ اس کی خوبیاں قابلِ ذکر ہیں۔ اول یہ کہ اس کی زبان فطری سلاست رکھتی ہے۔ دوم یہ کہ جو قصہ منظوم کیا گیا ہے اس کے اجزا تناسب کے اعتبار سے خوب ہیں۔ سوم یہ کہ تشبیہات و استعارات فطری انداز رکھنے کے باعث مخالف مذاق صحیح نہیں ہیں۔ چہارم یہ کہ مبالغے اناپ شناپ نہیں ہیں ان کا اعتدال ایسا ہے کہ سچی شاعری کا منافی نہیں ہے۔ پنجم یہ کہ رسم و رواج ملک کے بیانات بڑی صحت کے ساتھ حوالہ قلم ہوئے ہیں۔ ششم یہ کہ جو سین یعنی معاملہ خارجیا بیان ہوا ہے۔ تصویر کا حکم رکھتا ہے۔ ہفتم یہ کہ تمام امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ پیرایۂ شاعری میں بڑی راستی اور پُر تاثیری کے ساتھ زیب رقم ہوئے ہیں۔ ہشتم یہ کہ ہر جزو قصہ کچھ نہ کچھ اخلاقی یا تمدنی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ نہم یہ کہ تمام امور ذہنیہ اور معاملات خارجیہ کے بیانات فطری اسلوب رکھتے ہیں۔ جس کے باعث بے اختیار دل ان کی جانب کھنچتا ہے۔ المختصر یہ مثنوی داخلی اور خارجی دونوں قسم کی شاعری کا پورا لطف دکھاتی ہے۔ اور اپنے مصنف کی قابلیت عام کی بڑی مثبت ہے۔

اس مثنوی میں اکثر جگہ مرزا قتیل دہلوی نے اصلاح دی ہے۔ اس میں فارسی ترکیبیں محاورے و فقرے جو نظر آتے ہیں وہ مرزا قتیل کے فیضان علم کا نتیجہ ہیں۔
گارسن ڈی ٹاسی نے مثنوی سحر البیان اور بدر منیر کو دو علیحدہ علیحدہ تصانیف خیال کیا ہے۔ لیکن دراصل قصۂ بدر منیر مثنوی سحر البیان کا دوسرا نام ہے۔
میر شیر علی افسوس[1] کے میر حسن سے بیحد دوستانہ تعلقات تھے۔ یہ اور حسن

---

[1] افسوس فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ممتاز اہل قلم میں ہیں۔

دونوں ایک ہی جگہ یعنی نواب نوازش علی خاں کے پاس ملازم تھے۔

میر حسن کے انتقال کے کوئی سترہ برس بعد افسوس نے ۱۲۱۸ھ ۱۸۰۴ء میں ڈاکٹر جان گلگرسٹ کی فرمائش سے مثنوی سحرالبیان پر ایک دیباچہ تحریر کیا تھا۔ جس میں مصنف کے حالات زندگی اور مثنوی کے محاسن مرقوم ہیں۔

ڈی ٹاسی نے تاریخ ادبات ہند میں اسی دیباچے کی مدد سے میر حسن کے حالات مرتب کیے ہیں۔

دیباچہ میں دیباچہ نگار نے اپنا نام وغیرہ کہیں بھی نہیں بتایا۔ ڈی ٹاسی بھی دیباچہ نگار سے ناواقف ہے۔ البتہ دیباچہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب دیباچہ میر حسن کے خاص دوست اور دونوں ایک ہی سرکار کے نوکر اور ایک ہی صاحبزادے کے دس سال تک ہمنشین تھے۔ انھوں نے آپس میں ایک ہی طرح میں غزلیں بھی کہی تھیں۔

"دس برس تک دن رات ایک جگہ پر رہے۔ بلکہ آپس میں غزلیں ہم طرح ہوئیں اور صحبتیں شعر کی رہیں۔ لیکن نہ بطور استفادہ کے جیسا کہ نواب علی ابراہیم خاں مغفور نے بھی اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔ صاف اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں نے مشورہ سخن اس مرحوم سے بھی کیا ہے۔ اگر یہ بات حقیقت میں ہوتی تو کچھ عیب نہ تھا۔ ہرگاہ فقیر میر حیدر علی حیران کی شاگردی کا مقر ہے۔ باوجود اس کے شاعری اس کی کہ شاعری ان کی میر حسن سے زیادہ نہ تھی۔ پھر کس لیے اس بات کا انکار کرتا۔ قاعدہ یہی ہے کہ ایک سے سیکھتے ہیں اور دوسرے کو سکھاتے ہیں۔ لیکن جھوٹی بات پر اقرار نہیں کیا جاتا اور سچی سے انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ آخر چرخ تفرقہ پرداز نے باہم تفرقہ ڈالا اتفاقاً میرا روزگار سن گیارہ سو ننانوے میں صاحب عالم مرزا جواں بخت کی سرکار میں ہوا۔ میں ان کے ہمراہ بنارس آیا۔ (دیباچہ مثنوی سحرالبیان از افسوس)

دیباچہ اور علی ابراہیم خاں کے تذکرے سے پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کا مصنف منشی شیر علی افسوس ہے۔ کیونکہ علی ابراہیم نے اپنے تذکرہ میں افسوس کو حسن کا شاگرد لکھا تھا۔ اور افسوس نے دیباچہ معرض بحث میں گلزار ابراہیم کے اس بیان کی بڑے شد و مد کے ساتھ تردید کی ہے دوسری بات یہ ہے کہ نواب نوازش علی خاں کی سرکار میں وہ اور یہ ایک ہی ساتھ ملازم بھی تھے۔ سنہ ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۷ء) میں افسوس شہزادہ مرزا جواں بخت کے ساتھ بنارس چلے گئے تو ان کا ساتھ چھوٹ گیا۔

مثنوی کے قدیم مطبوعہ نسخوں میں یہ دیباچہ شامل ہے۔ چنانچہ میرے یہاں اس کے دو نسخے ہیں۔ ایک جان گلگرسٹ کے حکم سے سنہ ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) میں چھاپا گیا تھا۔ دوسرا عبدالماجد نامی نے مطبع طبّی میں سنہ ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں چھپوایا تھا۔ اس کے سرنامہ پر لکھا ہوا ہے کہ یہ مثنوی بیحد نایاب ہے اور پانچ دفعہ آگے بھی چھپ چکی ہے۔ حال کے مطبوعہ نسخوں میں یہ دیباچہ شریک نہیں ہے، اور بہت سے لوگ اس سے بے خبر ہیں۔

مثنوی سحرالبیان کا ترجمہ اُردو نثر میں نثر بےنظیر کے نام سے ہوا ہے جس کو میر بہادر علی حسینی[1] نے جان گلگرسٹ کے ایما سے سنہ ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں کیا تھا۔ یہ کلکتہ میں سنہ ۱۲۱۸ھ (۱۸۰۳ء) میں چھپ چکا ہے۔

ترجمہ بامحاورہ صاف اور سلیس اُردو میں کیا گیا ہے۔ مترجم نے اس کو دلپذیر بنانے کی بے حد کوشش کی ہے۔

مرزا قتیل، مصحفی اور فخرالدین[2] ماہر نے مثنوی پر تاریخی قطعات لکھے تھے جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:-

پے تفتیش تاریخ ایں مثنوی — کہ گفتش حسن شاعرِ دہلوی

---

[1] میر بہادر علی حسینی فورٹ ولیم کالج سے متعلق اور وہاں کے میر منشی تھے۔

[2] فخرالدین ماہر اشرف علیخاں پٹھان کے فرزند اور مرزا رفیع سودا کے شاگرد۔ ان کا وطن لکھنؤ تھا۔ طبقات الشعراء از کریم الدین صفحہ ۱۹۱

زدم غوطہ در بحرِ فکرِ رسا ۔۔۔ کہ آرم بکف گوہرِ مدعا
بگوشم زہاتف رسید ایں ندا ۔۔۔ بریں مثنوی باد ہر دل فدا
۱۱ ھ ۱۹

میاں مصحفی کو جو بھایا یہ طور ۔۔۔ انھوں نے بھی کر فکر از راہِ غور
کہی اس کی تاریخ یوں برمحل ۔۔۔ یہ بت خانۂ چین ہے بے بدل
۱۱ ھ ۹۹

سُنی جب کہ ماہر نے یہ مثنوی ۔۔۔ تو محظوظ ہو فکر تاریخ کی
یہ مصرع پڑھا وُو ہیں پاکر فرح ۔۔۔ ہے اس مثنوی کی یہ نادر طرح
۱۱ ھ ۹۹

کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں سحر البیان کے دو قلمی نسخے ہیں۔ ان میں ایک زیادہ قدیم خوشخط مطلا ہے جو ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳ء یعنی مصنف کی وفات کے سات سال بعد لکھا گیا دوسرا بھی قدیم ہے جو مصنف کی وفات کے اکیس سال بعد ۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء میں بمقام برہان پور مکتوب[1] ہوا۔ اس کے آخر میں حسب ذیل تاریخی قطعہ ہے جو مطبوعہ نسخوں میں نہیں پایا جاتا۔

ہیں مرزا مغل میرے اک آشنا ۔۔۔ یہ قصہ مجلّا میرے پاس لا
کہا اس کو ٹک تم مطالعہ کرو ۔۔۔ کہ اس کے معانی پہ تم دل دھرو
یہ کہکر حسن نے کہانی کہی ۔۔۔ یہی سچ ہے کہ طور اس کے نئی

---

[1] اس کے علاوہ ایک نسخہ بھی ہے، اس پر سنہ کتابت تحریر نہیں لیکن منشی شیر علی افسوس کا دیباچہ ہے۔ دیباچہ شروع سے مکمل ہے لیکن کاتب نے آخر کا کچھ حصہ حذف کر دیا ہے۔ دیباچہ کے خاتمہ پر یہ شعر درج ہے ؎

یہ مہلت غنیمت ہے کرلے وہ کام ۔۔۔ کہ جس سے رہے تا ابد نیک نام

مثنوی کے ابتدائی ورق پر ایک مہر ثبت ہے مگر صاحب مہر کا نام پڑھا نہیں جاتا۔ البتہ مہر میں ۱۲۳۷ھ لکھا ہوا ہے انڈیا آفس کے کتب خانہ میں اس مثنوی کا ایک نسخہ نمبر ۱۳۱ پر موجود ہے جو منصور نامی شخص کا ۱۷ رجب ۱۲۳۶ھ کا مکتوبہ ہے (اردو مخطوطات از بلوم ہارٹ صفحہ ۸۶)

کہی اس کی تاریخ یاروں نے مل　　کہ جو تھے وہاں سب کے سب اہل دل

میاں مصحفی و رفیق[1] و شفیق[2]　　کہ سید حسن کے ہیں دونوں رفیق

کہا تم کو ہے ذوق تاریخ کا　　کہو خوش ہو تاریخ سے دل مرا

اس عاصی کو تھی ان کی خاطر عزیز　　ہے خاطر سے بہتر نہیں کوئی چیز

سنو یارو اب مجھ سے تاریخ کو　　برائے خدا اس کی ٹک داد دو

کہ تاریخ تعمیہ میں ہے کمال　　وہ عاقل جو رکھتا ہے اسکا خیال

بنائے زکا[3] حسن بدر منیر　　کہ تاریخ قصہ کی ہے بے نظیر

ہزار آفریں اس کے ناظم کو ہو　　الٰہی حسن کو رکھو سرخرو

(※)

رموز العارفین میر حسن کی سب سے پہلی اور کمیاب مثنوی رموز العارفین ہے جو ۱۱۸۸ھ میں لکھی گئی۔ اس کی تصنیف کے تقریباً چار سال بعد تذکرہ شعرائے اردو مرتب ہوا اور اسی عرصہ میں مثنوی گلزار ارم بھی تمام ہوئی اور گیارہ سال بعد مثنوی سحر البیان معرض تحریر میں آئی۔

رموز العارفین، مثنوی مولانا روم کی بحر اور اسی کے طرز میں ہے۔ اسکے تخیل اور انداز بیان کا انحصار بالکلیہ مثنوی شریف پر رکھا گیا ہے۔ مثنوی میں ابراہیم ادہم بادشاہ بلخ کے سلطنت سے کنارہ کش ہو کر فقیر ہونے کا حال نہایت پردرد انداز میں لکھا ہے اور جابجا مثنوی مولانا روم کے اشعار موقع کے لحاظ سے تضمین کیے ہیں اس کے

---

[1] رفیق مرزا اسد اللہ بیگ کا تخلص تھا جو حکیم ثناء اللہ فراق کے شاگرد اور سلطان بہادر شاہ ظفر کے خاص آدمی تھے طبقات الشعراء از کریم الدین صفحہ ۴۳۲

[2] شفیق مظہر علی خاں کا تخلص ہے۔ یہ حکیم ثناء اللہ فراق کے شاگرد تھے۔ طبقات الشعراء از کریم الدین صفحہ ۲۲۹
اس قطعہ میں انہی شعراء کی جانب اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

[3] بنائے زکا کہ الف است آں را دور کند و باقی عدد آں را گرفتہ یعنی عدد ز۔ک با عدد بے نظیر مخلوط سازد مدعا حاصل شود یعنی تاریخ می برآید

ز۔ک۔بے نظیر
۱۱　۸　۹۹

ساتھ بزرگوں کے اقوال اور حکایتیں بطور تمثیل پیش کر کے ان سے نہایت لطیف نکتے پیدا کیے ہیں۔

اس تصنیف کی وجہ تحریک حضرت خواجہ میر دردؒ کی تربیت اور انکا فیضان صحبت ہے۔ اس لیے کہ ابتدا میں میر حسن خواجہ صاحب سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اور یہ دلی چھوڑ کر لکھنؤ آنے تک خواجہ صاحب کے متبع رہے۔ لیکن ان کو یہاں کوئی ایسا رہنما نہیں ملا جو خواجہ صاحب کا صحیح جانشین بنکر اس رنگ پر قائم رکھتا اور یہ ترقی کرتے اسی زمانہ میں لکھنؤ میں میر ضیاء الدین ضیا اور ان کے بعد مرزا رفیع سودا آئے۔ شروع میں میر حسن نے میر ضیا سے تلمذ حاصل کیا۔ جب ان کا کلام پسند نہ آیا تو مرزا رفیع سودا کی طرف رجوع ہوئے اس کے علاوہ ان کو میر تقی میر اور میر سوز کا رنگ بھی بہت مرغوب تھا اور ان کی اتباع میں بھی بہت کچھ کہا۔ ان متضاد انداز بیان اور مختلف اصلاحوں کے باعث ان کا مذاق سخن سابقہ روش کے خلاف حسن وعشق اور گل وبلبل کے حکایات کی جانب مائل ہوگیا۔ اور پہلے کے صوفیانہ رنگ کا اثر باقی نہیں رہا۔ دوسری بات کہنے کی یہ ہے کہ اسی عرصہ میں مرزا قتیل دہلوی سے ان کے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ مرزا کے فیض صحبت اور ان کے اثر سے فارسی محاورات پر انہیں اچھا عبور حاصل ہوگیا۔ انھوں نے اکثر مواقع پر ہندی الفاظ کی درشتی کو دور کر کے فارسی کی آمیزش سے زبان میں شیرینی وحلاوت پیدا کی اور شاعری کی صنائعوں سے اس میں طرح طرح کی لطافتوں اور نزاکتوں کا ایک صحیح معیار قایم کیا۔ فارسی سے اکثر الفاظ و محاورات، استعارے اور تشبیہیں، طرز تخیل اور تلمیحات زبان اُردو میں داخل کیے۔

اس بیان سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ میر حسن پر ابتدا میں تصوف کا رنگ زیادہ غالب تھا۔ جس کا خاتمہ لکھنؤ آنے کے بعد ہوگیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے لیے ایک علیحدہ شاہراہ اختیار کی۔ جس کو آخر وقت تک نبھایا۔ اس لحاظ سے

مثنوی رموز العارفین ان کے وسطی زمانہ کا کلام ہے گو اس میں بعد کی تصنیفات کی طرح پختگی، روانگی اور زور بیان نہیں ہے مگر کلام صاف اور پر اثر ہے۔ البتہ چند مقامات پر لفظی تعقید پائی جاتی ہے بعض جگہ متروک الفاظ استعمال کیے ہیں[1]۔ لیکن اس سے ان کی دیگر خوبیوں اور کمالات فن پر کوئی برا اثر مترتب نہیں ہوتا اور اس واسطے بھی اس کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے کہ یہ ان کی ابتدائی اور مسلسل نظم ہے۔

مصنف نے مثنوی کی وجہ تصنیف حسب ذیل اشعار میں بیان کی ہے۔

شاعری میں عمر کھوئی ہے تمام	میں نے عقبیٰ کا کیا ہرگز نہ کام
اپنی اس بیہودگی سے ہوں خجل	شعر لکھنے سے پھرا ہے میرا دل
جی میں ہے وہ جو ہوئے ہیں نیک نام	کچھ لکھوں میں ان بزرگوں کا کلام
جس کے سننے سے ہو عقبیٰ کا حصول	کوئی دم میں جاؤں اس دنیا کو بھول

کتاب کا نام اور سنہ تصنیف ذیل کی ابیات سے ظاہر ہوتا ہے۔

عارفوں کی سب کہ ہیں رمزیں لکھیں	نام اس کا ہے "رموز العارفین"
جب بھرا دُرِ معانی سے یہ طشت	تھے ہزار و یک صد و ہشتاد و ہشت

تذکرہ میں میر حسن نے اپنے حالات کے تحت اس مثنوی کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی زندگی میں مقبول ہو چکی تھی۔

رموز العارفین گفتہ است کہ مقبول دلہا گردیدہ مشہور شدہ است[2]

تذکرہ نویسوں نے اس مثنوی کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور اس سے بہت

---

[1] مثلاً ٹک۔ ایدھر۔ اودھر۔ کیدھر۔ لوہو۔ تھوڑ (جگہ) اگم پانی (بہت پانی) جاگہ۔ نپٹ وغیرہ۔

[2] تذکرہ میر حسن ص ۸۶

کم لوگ واقف ہیں۔ اس کے طبع کرانے کی مجھے ایک مدت سے آرزو ہے اسی بنا پر میں نے میر حسن کے حالات زندگی جمع کرکے ایک مبسوط مضمون کی شکل میں مرتب کیے اور اُسے آج سے تین سال قبل رسالۂ زمانہ میں اشاعت کے لیے بھیجا جو سنہ ۱۹۳۱ء کے تین نمبروں[1] میں شایع ہوئے۔ لیکن اصل مثنوی کو اس لئے نہ چھپوا سکا کہ میرے پاس اس کا جو مخطوطہ ہے وہ جدید الخط ہے۔ حال میں اس کا ایک خوشخط مخطوطہ مولوی سید محمد حسین صاحب بلگرامی سابق صدر محاسب سرکار عالی کے کتب خانہ سے میسر آیا۔ بلگرامی صاحب کا مخطوطہ قدیم ہے اور مصنف کی وفات کے دوسرے سال بمقام لکھنؤ ۲۱ محرم سنہ ۱۲۰۳ھ کو تمام ہوا ہے اور یہی شایع کیا جا رہا ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن کے خود نوشتہ حالات جو انھوں نے اپنے تذکرہ میں تحریر کیے ہیں پیش کیے جائیں اور مزید برآں قدیم اور مستند تذکروں میں ان کے جو حالات نظر سے گزرے وہ بھی شریک کر دیے جائیں تاکہ میر حسن کی زندگی کا ایک نہایت صحیح اسنادی سرمایہ ایک جگہ مہیا ہو جائے اس سے یہ بھی واضح ہوگا کہ ان کے کلام اور مذاق کی نسبت ان کے معاصرین اور دیگر نقادانِ فن کی کیا رائے ہے۔

۱۔ تذکرۂ شعرائے اردو از میر حسن دہلوی

پوشیدہ نماند کہ اصل این فقیر ابن غلام حسین ولد میر عزیز اللہ بن میر امامی ہروی از ہرات است، میر امامی نور اللہ مرقدہٗ ہفت قلم و فاضل متبحر بودند بسبب فضیلت در شاہجہاں آباد آمدہ بین الاقران ممتاز گردیدند، گاہ گاہ شعر ہم میفرمودند پس این عاجز سخن را سرشتہ شاعری اجدادی است نہ امروزی حاصل کہ از صغر سن

---

[1] میرا یہ مضمون ماہ جنوری۔ فروری۔ و اگست سنہ ۱۹۳۱ء کے پرچوں میں چھپا۔

میلان طبیعت این فقیر بطرف سخن بیشتر بود بارے حق تعالیٰ درین فن کم و بیش موافق
ظرف استعداد قبولیت بخشید، اصلاح سخن از میر ضیا سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرز او
شان از من کماحقہ سرانجام نیافت برقدم دیگر بزرگان مثل خواجہ میر درد و مرزا رفیع
سودا و میر تقی پیروی نمودم شروع جوانی از گردش روزگار بد ہنجار کہ ہرگز بہ کسی
وفائے نکردہ است بطرز لکھنؤ و فیض آباد رسیدم۔ بارے کم و بیش از قدردانی نواب
فلک جناب سالار جنگ بہادر دام اقبالہ بلب نان رسیدہ در خدمت مرزا نوازش
علی خان بہادر صحبت گزیدم کہ خلف ارجمند اوست چنانچہ تا حال بہر نوع گزران
می نمایم اکثر بفرمائش نواب معلی القاب مرثیہ امام علیہ السلام نیز بہ گفتن می آید از انکہ
طبع عالی آن بزرگوار در ہمہ فن بلند افتادہ است علی الخصوص در علم موسیقی کہ از حضر
بیان بیرونست سوز ہائے مرثیہ طرح می نمایند و این جستہ برائے آخرت است
اجرہ الی اللہ و سردار جنگ بہادر نیز ہمین طور درین ذہن رسا و گوش شنوا دارد
حق تعالیٰ عمر و دولت ایشان را تا جہانست مع فرزندان قایم دارد۔ فقیر درین مدت
قریب ہفت ہزار بیت گفتہ باشد و یک ترکیب بند و یک رموز العارفین گفتہ است
کہ مقبول دلہا گردیدہ مشہور شدہ است دو سہ بند او ورا و خر قلمی خواہد شد (ص ۸۶)

۲۔ نکات الشعرا از میر تقی میر تصنیف ۱۱۶۵ھ

میر حسن متخلص بحسن جوان اہلیت، نوکر پیشہ اکثر در بندہ خانہ بتقریب مجلس تشریف
می آرد وضع مردم آدمیانہ دارد۔ مشق شعر از مرزا رفیع می کند۔ (نکات الشعرا صفحہ ۱۴۵)

۳۔ تذکرہ مصحفی از شیخ غلام ہمدانی مصحفی

از اوائل عمر چون طبیعتش موزون بود اکثر خود را مصروف و مشغول این شغل
خطیر میداشت و شعر خود را از نظر میر ضیاء الدین ضیا کہ در ان ایام از مشہوران
درین دیار بود می گزرانید بعد از آن کہ دور دور مرزا رفیع السودا شد و زبان ریختہ

چنانچہ کہ بود زیادہ درین دیار رواج یافت بحکم قوت ممیزہ برجادہ مستقیم اساتذہ مسلم الثبوت یعنے خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا میر تقی میر و میان محمد قایم درگزاشتہ زبان خود مرتبہ پاکیزگی و شستگی رسانیدہ دیوان ضخیم و مثنوی ہائے متعددہ در سلک نظم کشیدہ خصوصاً در مثنوی سحر البیان دارد ید بیضا نمودہ (ماخوذ از تذکرہ مصحفی قلمی)

۴۔ تذکرہ مجموعۂ نغز از میر قدرت اللہ خان قاسم

میر حسن خلف الصدق میر غلام حسین ضاحک اصلش از ایران و مولدش ہندوستان جنت نشان است در سید واڑہ دہلی کہنہ تولدش واقع شدہ گردش دور دوار وے را بدیار مشرق انداختہ در فیض آباد ملازم سرکار نواب سرفراز جنگ خلف رشید نواب سالار جنگ گشتہ شاگرد رشید میر ضیاء الدین ضیا است و از خدمت سرآمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا ہم استفادہ نمودہ طرز گفتارش بہ شاعر فصاحت افروز محمد میر سوز مرحوم مانا است مختصر کلام شاعر فصیح زبان عذب البیان است دیوانے مملو اقسام سخن دارد مثنوی بے نظیر و بدر منیر بے نظیر گفتہ و رواد سخنوری کہ مروج این وقت است دادہ و بیرون ازین مثنوی در ہجو بلدہ لکھنؤ و مدح شہر فیض بہر فیض آباد بنگلہ و سرگذشت راہ کہ ہمراہ نیزہائے شاہ مدار قدس سرہ راہی آن دیار شد بسیار خوب و پاکیزہ گفتہ بالجملہ سخن سنج عالی طبع بود (ص ۲۰۲ تا ۲۰۴)

۵۔ تذکرہ جلوۂ خضر تالیف سید فرزند احمد صفیر بلگرامی

میر حسن خندہ جبین شگفتہ مزاج ظریف الطبع تھے۔ اور اس میں تہذیب و شائستگی کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ میانہ قد خوش اندام گورا رنگ۔ جملہ قوانین شرافت اور آئین خاندان میں اپنے والد کے پابند تھے۔ اتنا تھا کہ داڑھی منڈاتے تھے سر پر بانکی ٹوپی۔ تن میں تنزیب کا انگرکھا۔ پھنسی ہوئی آستین کمر سے دوپٹہ بندھا۔ پہلے اپنے والد سے پھر خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے رہے۔ اودھ میں

میں جاکر میر ضیاء الدین کے شاگرد ہوئے اور مرزا رفیع سودا کو بھی غزل دکھائی لکھنؤ میں آکر ان کے کلام نے شہرت کا رنگ اڑایا۔ غزل میں میر سوز کا انداز بہت ملتا ہے۔ مثنوی سحر البیان کی حقیقت یہ ہے کہ زمانہ نے اس کی سحر البیانی پر تمام شعراء اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا۔ انتقال ۱۲۰۱ ہجری پہلی محرم کو ہوا۔ عمر کا حال نہ کھلا۔ لکھتے ہیں کہ پچاس برس سے زیادہ پائی۔ دو صاحبزادوں نے نام پایا۔ میر خلیق۔ میر خلق۔ (تذکرہ جلوۂ خضر حصہ اول جلوہ پنجم صفحہ ۱۸۲ تا ۱۸۴)۔

دیباچہ مثنوی سحر البیان

نوشتہ

منشی شیر علی افسوس

حمد کی لیاقت اسی صانع کو ہے جس نے عناصر اربعہ کو کہ آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہے اپنی قدرت کاملہ سے ربط دیکر ارکان ٹھہرایا اور کیفیت متوسط پر مرکبات کے اجسام کو بنایا لیکن انسان کو مخلوق سے شریف تر اور لطیف تر خلق کیا کہ نفس ناطقہ نے علاقہ اسی سے پکڑا اور وہی کلیات و جزئیات کی حقیقت سے ماہر ہوا یہاں تک کہ تعلیم تعلّم کا سلیقہ اسے بخوبی آگیا اور اس کی زبان میں بھی استعداد ہر لغت کے تلفّظ کی بخشی چنانچہ اس نے جس بولی کو چاہا سیکھ لیا بلکہ سکھا دیا پس لازم ہے کہ اس کے شکر میں ہر دم اپنی زبان گویا رکھے اور اس کے حمد کو ہر حال میں اپنا ورد کرے۔

نہ بھول اپنے خالق کو اے دل نہ بھول ۔۔۔ کہ یاد اس کی ہے دو نو جگ کا حصول
اسی کو مددگار اپنا سمجھ ۔۔۔ اسی کو فقط یار اپنا سمجھ
برے وقت میں کوئی اس کے سوا ۔۔۔ ترے کام آوے یہ امکان کیا

محبت سے سب کی اُٹھا اپنا دل | فقط اس سے ہی بس لگا اپنا دل
زباں تیری گویا رہے جب تلک | اور امکان سخن کا رہے جب تلک
کیا کر ثنا اسے جہاں آفریں | سخن کوئی بس اس سے بہتر نہیں
جو بعد اس کے منظور ہو کوئی بات | تو کہہ نعت احمد شہِ کائنات

فی الواقع ستودہ خدا سب انبیا و اوصیا ہیں۔ تعریف اُن کی موافق مقدور ہر ایک ضرور ہے خصوصاً نعت و منقبت خاتم المرسلین اور اسکے وصی امیر المومنین علیہما السلام کی کیونکہ انھوں ہی نے دنیا میں ہم کو راہِ ہدایت کی بتلائی کہ ہم نے منزل ایمان کی بسہولت پائی۔ عاقبت میں بھی امید شفاعت کی اور نجات کی انہی سے رکھتے ہیں۔

بھروسا کسی کا نہیں ایک ذرا | ہے اُن کا ہی ہم کو فقط آسرا
نبیؐ و علیؑ اپنے ہیں پیشوا | نبیؐ و علیؑ اپنے ہیں رہنما
انہی سے ہے کونین میں مجھکو کام | وہ مولا ہیں میرے میں اُنکا غلام
درود اُن پہ اور اُن کی اولاد پر | بدل بھیجتا ہوں میں شام و سحر

بعد اس حمد و نعت کے مثنوی سحر البیان اسم بامسمیٰ ہے کیونکہ اسکا ہر شعر اہل مذاق کے دلوں کے لبھانے کو گویا منتر ہے۔ اور ہر داستان اسکی سحر سامری کا ایک دفتر جو چیز کہ حقیقت میں خوب ہوتی ہے وہی طبائع کو مقبول و مرغوب ہوتی ہے۔ درست ہے کہ اسکا اندازہ سراپا اعجاز ہے اور وہ ہر ایک صاحب طبیعت کی دستار تعریف اُسکی جہاں تک کیجیے بجا ہے کیونکہ فصاحت و بلاغت کا ایک دریا بہا ہے احیاناً اگر کسی شعر میں غلطی یا اُسکی بندش میں سستی پائی جائے تو قابل نام دھرنے کے اور اعتراض کرنے کے نہیں۔ اسلیے کہ جہاں ہنر کی کثرت ہوتی ہے وہاں عیب بقلت شمار میں نہیں آتا اور تعرض اسکا منصف مزاجوں کو نہیں بھاتا بقول شخصے

(ع) شعر گر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست۔ صلے کلام اس کے ماجرا یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ مرحوم نے ایک دوشالہ خاص اپنے اوڑھنے کا دست بقچے میں سے نکلوا کر مصنف کو عنایت کیا۔ رتبہ تو اسکا البتہ بڑا پہ دل گھٹ گیا اسلیے کہ مطلب دلی حاصل نہوا لیکن یہ کھوٹ صرف طالع کی ہے کیونکہ مال کھرا خریدار اتنا بڑا اور سودا خاطر خواہ نہوا بلکہ گھاٹا آیا۔

یہ چند سطریں مصنف کے حسب و نسب اور احوال میں۔ مصنف اسکا میر حسن دہلوی متخلص حسن خلف میر غلام حسین ضاحک کا وطن اجداد شہر ہرات قوم سادات گردش فلکی سے انھوں نے شہر مذکور کو چھوڑا۔ اور دلی میں آکر پرانے شہر کا رہنا اختیار کیا وہیں یہ بزرگ پیدا ہوا الملکہ سن تمیز کو پہنچا۔ دادا اس عالی قدر کا

سنتے ہیں کہ حاجی و فاضل تھا لیکن باپ کو فضیلت نہ تھی۔ مگر طالب علمی میں شرح مُلّا تک پڑھا تھا پر فارسی
میں استعداد اچھی تھی بلکہ شعر بھی متین و رنگین گاہے گاہے اس زبان میں کہتا تھا چنانچہ یہ رباعی طبع زاد
اس کی راقم نے اس کی زبانی سُنی ہے۔

زیاد دلا کہ غمگساران رفتند　　سیمیں بدنان و گلعذاران رفتند
چون بوئے گل آمدند بر باد سوار　　در خاک چو قطرہائے باران رفتند

قصیدہ بھی ایک آدھ میں مغفور کا رتبہ دار دیکھا ہے لیکن ہزل پر از بسکہ مزاج مرغوب تھا غزل
کہنی ترک کی تھی قیاست — کا مشغول تھا تخلص اُس کا پردال ہے پر ظاہر نہایت ثقہ اور متشرع
اکثر عمامہ عربی سبز سر پر باندھا رہتا تھا۔ اور جامہ کم گھیر کا پہنتے کا گلے میں داڑھی متوسط لیکن لبی ہوئی
قد میانہ گندم گون لیکن میر حسن داڑھی منڈواتے تھے اگرچہ جامہ تہمہ ان کا بھی ویسا ہی تھا اور پگڑی کی بندش
قدیم ہندوستان زادوں کی سی قد لمبا تھا اور رنگ گندمی ہر چند وضع تو ایسی تھی پہ شوخ مزاج و لطیفہ گو
بھی تھے نہ ہزال و فحاش۔

سوائے اسکے بردباری اور ملنساری انکی خلقت میں تھی کسی کو میں نے اس عزیز سے ناشاکی نہیں
پایا اور بیزار نہیں دیکھا طبع انکی موزوں طفولیت سے تھی شعر کی طرف رغبت رکھتا تھا۔ اکثر خواجہ میر درد
کی صحبت سے مستفید شاہ جہان آباد میں لڑکائی کا سن بیچ ہوا ہے بعد برہم ہونے سلطنت کے شہر مذکور سے
مجبور اپنے والد کے ساتھ صوبہ اودھ میں آیا سکونت فیض آباد میں اختیار کی علاقہ روزگار کا نواب سالار
جنگ بہادر مرحوم کی سرکار میں بہم پہنچایا۔ مصاحب میرزا نوازش علیخاں بہادر سردار جنگ دام ثروتہ
کا ہوا مرزائے موصوف بڑا بیٹا نواب مغفور کا ہے۔ خدا اسے سلامت رکھے کہ اشعار سے اُسے رغبت اور
شعرا سے محبت ہے چنانچہ میر مذکور کو بھی اُسنے اپنا انیس و جلیس کیا تھا اور وہ تھا بھی لائق اگرچہ علم عربی
اُسے مطلق نہ تھا، ہاں فارسیت تھی بلکہ جستہ جستہ شعر یا کوئی رباعی کبھو کبھی لیتا تھا لیکن علم مجلس میں
بے بدل اور شعر ہندی میں اکمل تھا مشق سخن اُس نے اسی ملک میں میر ضیاء الدین ضیا تخلص سے کہ ہم مشق
مرزا رفیع سودا اور میر تقی میر کے تھے کی تھی۔ سوائے ان کے مرزائے مرحوم سے بھی ان کی غیبت میں اکثر
اوقات اصلاح لی تھی۔ چنانچہ اس کا اقرار راقم کے سامنے کیا ہے۔ غرض میر مرحوم صاحب دیوان ہے۔
غزل، رباعی، مثنوی، مرثیے میں سلیقہ نہایت خوب رکھتا ہے۔ بلکہ سوائے قصیدہ کے ہر قسم کی نظم پر قادر
تھا سچ تو یہ ہے ادا بندی کا حق اُس نے خوب ادا کیا۔ اور انداز شعر کا کس خوبی سے کہا، خدا بخش بیا مرزا راقم سے
کو اس سے دوستی دلی تھی۔ کبھو رنجش خفگی باہم نہیں ہوئی۔ حالانکہ اسی سرکار میں بھی نوکر اور اسی صاحبزادہ

کا ہم نشین تھا۔ دس برس تک دن رات ایک جگہ رہے بلکہ اکثر آپس میں غزلیں ہم طرح ہوئیں اور صحبتیں شعر کی رہیں لیکن نہ بطور استفادہ کے جیسا کہ نواب علی ابراہیم خاں مغفور نے بے تحقیق اپنے تذکرے میں لکھا ہے۔ صاف اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں نے مشورہ سخن کا اس مرحوم سے بھی کیا ہے۔ اگر یہ بات حقیقت میں ہوتی تو کچھ عیب نہ تھا۔ سرگادحقیر میر حیدر علی حیران کی شاگردی کا مقر ہے۔ باوجود اس کے کہ شاعری ان کی میر حسن سے زیادہ نہ تھی پھر کس لئے اس بات کا انکار کرتا۔ قاعدہ یہی ہے کہ ایک سے سیکھتے ہیں اور دوسرے کو سکھاتے ہیں لیکن جھوٹی بات برا قرار نہ کیا جانا اور سچی بات سے انکار نہیں ہو سکتا۔ آخر چرخ تفرقہ پرداز نے باہم تفرقہ ڈالا۔ اتفاقاً میرا روزگار سن گیارہ سے ننانوے میں صاحب عالم مرزا جوان بخت کی سرکار میں ہوا میں ان کے ہمراہ بنارس میں آیا بعد اس کے اس بزرگ کو آخر ذیحجہ سن بارہ سو میں مرض الموت لاحق ہوا۔ ناں غرہ محرم کو کہ سنہ بارہ سو ایک شروع ہو چکے تھے اس دار فانی سے اس نے سرائے جاودانی کو کوچ کیا اور شہر لکھنؤ میں مفتی گنج کے بیچ مرزا قاسم علیخاں بہادر دام ظلہ کے باغ کے پیچھے مدفون ہوا خدائے کریم اس کو یہاں دار السلام عطا کرے اور وہاں قصر جنت بخشے۔

عدم سے مسافر جو آیا یہاں	مقرر وہ ایک روز جاویگا ولل
ہے جگ میں ہر چند وہ سر کہیں	پر اُسکا ٹھکانہ ہے زیر زمین
نہ غفلت میں اپنی تو اوقات کھو	ارے بیخبر جاگتے میں نہ سو
جہاں میں تو مہمان ہے چند روز	ترے جسم میں جان ہے چند روز
یہ مہلت غنیمت ہے کر لے وہ کام	کہ جس سے رہے تا ابد نیک نام

فی الواقع نیک نامی بھی عجیب چیز ہے انسان کا نام اسی سے زیادہ رہتا ہے یا کلام و اولاد سے سو وہ خوش نصیب بیٹے دونوں اس سمیت چھوڑ گیا چار بیٹے فضل الٰہی سے اس کے اب تک موجود ہیں۔ تین شاعر ہوئے بود و باش انھوں نے فیض آباد میں اختیار کی معاش نوکری پر کرے۔ چنانچہ میر مستحسن خلیق متخلص خلیق تخلص اور میر محسن محسن تخلص مرزا تقی بہو بیگم صاحبہ مادر آصف الدولہ مد ظلہا کے داماد کے رفیق ہیں اور میر محسن خلق تخلص داراب علیخان ناظر کے ساتھ ہے یہ اور خلیق دونوں صاحب دیوان ہیں شعر اپنے باپ ہی کے انداز پر کہتے ہیں لیکن خلیق کا سررشتہ اصلاح کا میاں مصحفی سلمہ اللہ سے تعلق رکھتا ہے خدا ان کو انھیں سلامت رکھے (یہ) چند فقرے بطور دیباچہ زبدۂ نوئیاں عالیشان مظہر شیر خاص شاہ نوع کیوان بارگاہ انگلستان مارکوئیس ولزلی لارڈ گورنر بہادر دام اقبالہ کے عہد میں کہ سنہ ۱۲۱۸ ہجری مطابق سنہ ۱۸۰۳ء کے ہیں حسب الارشاد صاحب والا مناقب جان گلکرسٹ بہادر مدرس ہندی دام لطفہ

کے اس عاصی نے لکھے اور اُن کو اس مثنوی کا ضمیمہ کیا۔

تعلیقات

میر شیر علی افسوس میر سید علی مظفر خان کے فرزند تھے اُن کے آباو اجداد خواف کے رہنے والے تھے اور سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادق رضؓ پر منتہی ہوتا ہے۔ اس سلسلہ سے سید بدر الدین نامی ایک بزرگ نے ہندوستان میں آکر نارنول (قریب آگرہ) میں سکونت اختیار کی۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں اُن کے والد اور چچا سید غلام علیخاں نارنول سے ترک وطن کر کے دلی چلے آئے اور نواب امیر خاں عمدۃ الملک بہادر انجام کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ افسوس سنہ ۱۱۴۸ھ میں دلی میں پیدا ہوئے سنہ ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) میں جب نواب امیر خاں کا انتقال ہوگیا تو اُن کے والد پٹنہ چلے آئے اور یہاں نواب میر قاسم علیخاں کے داروغہ سلیح خانہ مقرر ہوئے اس کے بعد افسوس اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ چلے آئے۔

افسوس کو شعر گوئی کا شوق قیام پٹنہ میں ہوگیا تھا چنانچہ لکھنؤ کی فضا نے ان کو اور گرما دیا۔ افسوس حیدر علیخاں حیراں کے خاص شاگرد تھے۔

لکھنؤ میں یہ نواب نوازش علیخان کی سرکار میں دس برس تک ملازم رہے نواب حسن رضا خاں نائب سلطنت کی سفارش سے کرنل اسکاٹ سے ملاقات کی اکرنل نے ان کو لائق پا کر دو سو روپیہ ماہوار پر مامور کر کے کلکتہ بھیجدیا اور زاد راہ کے لئے پانسو روپیہ بھی عطا کئے انھوں نے کلکتہ جاتے ہوئے مرشد آباد میں قیام کر کے مرزا علی لطف مصنف گلشن ہند سے ملاقات کی۔

افسوس فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ممتاز اور مشہور اہل قلم میں ہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں آرائش محفل (تصنیف سنہ ۱۲۱۹ھ ۱۸۰۴ء) زیادہ مشہور ہے۔ یہ ہندوستان کی تاریخ ہے۔ اس کی تالیف میں افسوس نے بہت سی کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور اس کا سب سے بڑا ماخذ منشی سوجان رائے کی خلاصۃ التواریخ ہے۔ دوسری کتاب گلستان سعدی کا اردو ترجمہ ہے جو باغ اردو کے نام سے موسوم ہے اس کے علاوہ ان کا دیوان بھی ہے۔ افسوس کا انتقال سنہ ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) میں ہوا۔

میر بہادر علی حسینی کے حالات زندگی نہیں ملتے ہیں یہ بھی فورٹ ولیم کالج

کے میر منشی تھے۔ انہوں نے حسب ذیل کتابیں تالیف کیں۔

۱۔ اخلاق ہندی لکھی جو ہتوپدیش کے ایک فارسی ترجمہ کا با محاورہ صاف اور سلیس ترجمہ ہے۔ فارسی ترجمہ شاہ نصیر الدین بہاری کے حکم سے مفتی تاج الدین نے مفرح القلوب کے نام سے کیا تھا۔

۲۔ گلکرسٹ کی گرامر کا اردو میں ترجمہ کیا جو صرف و نحو اور فن عروض کا رسالہ ہے۔

۳۔ تاریخ آسام مصنفہ شہاب الدین طالش کا ترجمہ کیا، جس میں میر جملہ کے فتوحات آسام کا ذکر ہے۔

۴۔ چوتھی کتاب نثر بے نظیر ہے جو مثنوی سحر البیان کی اردو ہے۔

ماخذ

۱۔ نکات الشعراء ..... میر تقی میر .... طبع علیگڈھ ... صفحہ ..... (۱۴۵)

۲۔ تذکرہ مصحفی .... شیخ غلام ہمدانی مصحفی ...... مخطوطہ

۳۔ گلزار ابراہیم .. علی ابراہیم خاں ....

۴۔ تذکرۂ شعرائے اردو ... میر حسن دہلوی .... طبع علیگڈھ صفحہ (۱ تا ۸ و ۸۵)

۵۔ مجموعۂ نغز .... قدرت اللہ خاں قاسم ..... مطبوعہ لاہور ... صفحہ (۲۰۲)

۶۔ گلشن ہند ...... علی لطف .... طبع آگرہ ... صفحہ (۹۲)

۷۔ تذکرۂ شعرائے اردو کریم الدین .... مطبوعہ ... صفحہ (۲۱۳)

۸۔ طبقات الشعراء .. قدرت اللہ خاں شوق .... مخطوطہ

۹۔ گلشن بیخار .... مصطفیٰ خاں شیفتہ ...... مطبوعہ ... صفحہ (۵۷ و ۵۸)

۱۰۔ سخن شعراء .... عبد الغفور خاں نساخ ..... مطبوعہ ... صفحہ (۱۳۰)

۱۱۔ نغمۂ عندلیب قطب الدین خان باطن .. .. صفحہ (۶۷)

۱۲۔ گل رعنا ...... مولوی عبد الحی ...... اعظم گڈھ صفحہ (۲۳۴)

۱۳۔ آب حیات ..... مولانا محمد حسین آزاد .... صفحہ (۲۳۴)

۱۴۔ جلوۂ خضر... صفیر بلگرامی.......... مطبوعہ آگرہ.. صفحہ (۱۸۲ تا ۱۸۳)

۱۵۔ خمخانۂ جاوید..... لالہ سری رام.......... ؍؍ جلد اول... صفحہ (۴۲۹ تا ۴۴۲)

۱۶۔ قاموس المشاہیر۔ نظامی بدایونی.......... ؍؍ جلد دوم... صفحہ (۲۰۲)

۱۷۔ بہارستان سخن۔ شمس العلماء امداد امام..... طبع لکھنؤ جلد دوم صفحہ (۳۳۶ و ۳۳)

۱۸۔ نثر بےنظیر... میر بہار علی حسینی.......... طبع کلکتہ.... صفحہ (۴)

۱۹۔ مقدمہ دیوان حالی۔ الطاف حسین حالی..... طبع نامی پریس کانپور صفحہ (۲۰۸ و ۲۱۳)

۲۰۔ رسالۂ اردو..... انجمن ترقی اردو.......... بابتہ سنہ ۱۹۲۶ء... صفحہ.... (۹۱)

۲۱۔ رسالہ اولڈ بوائے۔ مرتبہ اشہر.......... جلد ۲ نمبر ۸ سنہ ۱۹۲۸ء صفحہ... (۱ تا ۴)

۲۲۔ اردوئے معلیٰ ... حسرت موہانی.......... جلد ۸ نمبر ۴ سنہ ۱۸۷۰ء صفحہ... (۱ تا ۶)

۲۳۔ اورینٹل کالج میگزین۔ مرتبہ شفیع ایم اے..... جلد ۲ نمبر ۴ سنہ ۱۹۲۶ء صفحہ... (۱ تا ۲)

۲۴۔ تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ.......... طبع نولکشور ترجمہ اردو صفحہ (۴۳ تا ۴۴)

۲۵۔ تاریخ ادبیات ہند۔ گارساں ڈی تاسی....... طبع پیرس سنہ ۱۸۳۹ء جلد (۱) صفحہ (۱۹۵)

۲۶۔ مثنوی سحر البیان۔ میر حسن.......... طبع کلکتہ

۲۷۔ انڈیا آفس کیٹیلاگ۔ بلوم ہارٹ.......... صفحہ (۸۷)

۲۸۔ رسالہ ہندستانی۔ تارا چند.......... جلد ۱ سنہ ۱۹۳۱ء

۲۹۔ رسالہ تحقیقات علمیہ۔ عثمانیہ یونیورسٹی.......... مطبوعہ حیدرآباد۔ صفحہ (۱۳۱)

سید احمد اللہ قادری
ایڈیٹر تاریخ
حیدرآباد دکن

عثمان شاہی
۲۷ رمضان سنہ ۱۳۵۲ھ

مثنوی

رموز العارفین

تصنیف

میر حسن دہلوی

در سنہ ۱۱۸۸ ہجری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد رب العالمین

ہے سزاوارِ ثنا وہ کردگار — جس نے کی وحدت سے کثرت آشکار

ایک دانے سے عیاں خرمن کیا — ایک شعلے سے جہاں روشن کیا

ہے اوسی کے نور کی ہر طرف سیر — کیا چراغِ کعبہ و کیا شمعِ دیر

چون چراغِ نورِ شمع را کشید — ہر کہ دید آں را یقین آن شمع دید

ہمچنیں تا صد چراغ از نقل شد — دید آن آخر لقائے اصل شد

دیکھ تو کثرت میں وحدت کو ذرا — سو مقاموں میں یہ چھائی ہے نوا

کب صدا سے کوئی باہر ہے مقام — ہر مقاموں کو صدا ہی سے ہے کام

کیا رباب و ارغنوں و چنگ پر — ہے صدا چھائی ہوئی ہر رنگ پر

حق محیطِ جملہ آمد اے پسر — آن وارد کارش از کارِ دگر

گرچہ ہے سب کچھ اسی کا یہ ظہور / پر کہا جاتا نہیں سایہ کو نور

نور اپنی جا ہے سایہ اپنی جا / نیک و بد میں فرق کرنا ہے بھلا

گر نہ ہوتا یہ تو بارے اے عزیز / کیوں خدا دیتا تجھے عقل و تمیز

ناحق اور حق کو ذرا پہچان تو / دل سے آ حق کی طرف کو ہاں تو

بے مدد حق کے نہیں ہے گرچہ کام / پر بھلا تو جہد کرتا رہ مدام

گر گراں رو گر شتابندہ بود / ہر کہ جویندہ ست یابندہ بود

ہے وہ ایزد لائق حمد و سپاس / دل دیا عارف کو جس نے حق شناس

جس کو چاہا اسکو کھینچا اپنی طرف / پر اُسے جسکو دیا تھا اُتنا ظرف

کھینچ اپنی سمت سے للّٰہ کیا / ملک عرفاں کے طرف راہی کیا

اپنا طالب جس کو چاہا او حبیب / معرفت کی دولت اسکو کی نصیب

نعت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

ہیں حبیب اور دوست اُسکے مصطفیٰ / بعد اُن کے انبیا اور اولیا

وہ محمدؐ وارث کون و مکاں / جسکی خاطر یہ بنے دونوں جہاں

وہ محمدؐ رحمۃ للعالمین / جس کا خادم ایک جبریل امین

نعت میں اُسکے کہوں کیا میں سخن / میں کہاں اور نعت اُسکی اے حسن

مدح جسکی خود کرے پروردگار / کیا ثنا اُسکی کہوں میں خاکسار

مرتبہ اُس کا یہاں تک ہے بلند / عقل کل کی واں نہیں لگتی کمند

شافع محشر ہے وہ خیر البشر / ہو درود اُس پر اور اُسکی آل پر

وہ جو ہیں وا اُسکے ہیں اور دوستدار / چار یار و چار یار و چار یار

ان کا میں مداح ہوں یاذوالجلال
پنجتن کے فضل سے کر دے نہال

مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات

فکر و غم کی قید سے آزاد رکھ
دین و دنیا میں الٰہی شاد رکھ

مشکلیں سب خود بخود آسان کر
فکر میں روزی کی مت حیران کر

دے فراغت اتنی اس دنیا میں تو
ہو سکے عقبیٰ کی جس سے جستجو

عارفوں کے رمز سے آگاہ کر
ملک درویشی کا مجھکو شاہ کر

دے بصارت حق شناسی کی مجھے
جس طرف دیکھوں تو میں دیکھوں تجھے

شاعری میں عمر ہے کھوئی تمام
میں نے عقبیٰ کا کیا ہرگز نہ کام

اپنی اس بیہودگی سے ہوں خجل
شعر کہنے سے بھرا ہے میرا دل

جی میں ہے وہ جو ہوئے ہیں نیکنام
کچھ لکھوں میں اُن بزرگوں کا کلام

جسکے سننے سے ہو عقبیٰ کا حصول
کوئی دم تو جاؤں اس دنیا کو بھول

جو سنے اور جو پڑھے سو شاد ہو
عاقبت اندیشی اپنی یاد ہو

رو دے کوئی اپنی غفلت پر ذرا
حق کو پہچانے کوئی دم تو بھلا

بات حق کی گوش دل سے گر سنے
اس گلستاں سے گل مقصد چنے

فکر کو ایدھر کی چھوڑے ایکدم
ٹک تو لائے دل پر اودھر کا بھی غم

دل پہ لگ جائے جو بات اس طرف کی
میرے حق میں دے دعا شاید کوئی

گرچہ ہیں یہ درد کی باتیں لکھیں
پر ثمر دیں گی خوشی کا یہ کہیں

از پس ہر گریہ آخر خندہ ایست
مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

دھیان رکھ اس بات پر یعنی حسن
یادگاری کو لکھے ہے یہ سخن

حظ اٹھائے اس سے جو شاہ و گدا
چاہیئے حق میں مرے دیوے دعا

ہو دعا شاید کسی کی کارگر
تا حصول اس سے مجھے کچھ ہو ثمر

عارفوں کی بسکہ رمزیں ہیں لکھیں
نام اس کا ہے "رموز العارفین"

جب بھرا دُرِّ معانی سے یہ طشت
تھے ہزار و یکصد و ہشتاد و ہشت

تھا مہینہ نیک اور سالِ سعید
جب ہوئی تحریر یہ گفت و شنید

بشنوید اے دوستان این داستان
خود حقیقت نقلِ حالِ ماست آن

دنیا دار کا سوال فقیر کا جواب

ہے حکایت یوں کہ اک درویش تھے
عشق میں اللہ کے دلریش تھے

تھے وہ عارف اور صاحب حال تھے
واصلِ حق اور نیک اعمال تھے

چھوڑ کر دنیا ہوئے تھے وہ فقیر
عشق کو مرشد سمجھ اور دل کو پیر

حق کے در پر تھے وہ بیٹھے سر منڈا
اہلِ عرفاں میں تھا اُنکا سلسلا

رشتۂ الفت کی تھی سیلی پڑی
آہ دردآلود کی رکھے چھڑی

خرقہ و جبہ فقط ظل الہ
قبۂ افلاک کی سر پر کلاہ

دل کا اک کچکول تھا آگے دھرا
آرزو سے اسکی رہتا تھا بھرا

سرِ حق سے وہ غرض آگاہ تھے
دیکھنے کو تھے گدا پر شاہ تھے

ایک دنیا دار نے القصہ جا
چاشنیِ فقر کا پوچھا مزا

یعنی اے حضرت بتاؤ مجھکو تم
جا کئے جیتے ہوئے دنیا سے گم

حق نے یہ دنیا جو کی ہے کس لئے
اس سے سب لذت اُٹھائیں اسلیے

نعمتیں جو حق نے کی ہیں آشکار
پیویں کھاویں اُنکو جو ہیں ہوشیار

بندگی کر رکھ شریعت میں قدم
دین کر دنیا میں حاصل دمبدم

ہے سوال اپنا یہ اے عالیجناب
دے حقیقت کے مزے کا کچھ جواب

کیا مزہ ہے اس میں اور کیا رنگ ہے
بارے اس عالم کا کیسا ڈھنگ ہے

سنکے اُس درویش نے کیا برمحل
یوں حقیقت پر سنائی اک مثل

یعنے سُن اِس بات کو یار عزیز
اپنے دل میں ٹک سمجھ گر ہے تمیز

شرع کے معنی حقیقت تو نہیں
پر کہاں یہ فہم ہر اک کے تئیں

فی الحقیقت گر حقیقت کا بیاں
میں کہوں تو کیا کہوں اے مہرباں

تلخ یا شیریں مزہ ہو تو کہوں
یہ حقیقت ہے نہاں چپ ہو رہوں

نقل کیا اک برمحل پہنچی ہے آ
گوش دل سے سُن لے تو اسکو ذرا

حکایت برسبیل تمثیل

خوشتر آں باشد کہ راز دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اک محلے میں تھیں کتنی لڑکیاں
کھیل میں باہم تھیں وہ سب رہتیاں

گڑیاں کھیلا کرتی تھیں آپس میں وہ
تھیں بہم اس بات پر ہم قسمیں وہ

یعنے ہم میں سے بیاہی جائے جو
کھیل کی باتوں سے وہ غافل نہ ہو

جب چھٹیں سسرال سے میکے میں آ
ہاتھ سے جانے نہ دیں ہم یہ مزا

ہم قسم باہم ہوئیں اس قول پر
کتنی مدت جب گئی اس پر گزر

ناگہاں اُن میں سے شادی ایک کی
اتفاقاً اُن دنوں میں ہو گئی

بعد کتنے دن کے وہ سسرال سے
آئی میکے میں عجائب حال سے

رسم سے نوشہ کے جام وصل سے
جی میں خوش اور شاد کام وصل سے

اور چتون اور عالم اور ہے
دھیان گڑیوں سے نہ مطلب کھیل سے
خردسالی کی وہ باتوں سے غیور
دیکھ کر تب ایک نے یہ اسکا حال
کیوں بہن کیا تھا بہم قول وقرار
بیاہ میں تو نے مزا پایا ہے کیا
اس مزے سے ہم کو بھی آگاہ کر
گڑیوں کے بھی کھیل سے کیا ہے عزیز
تب کہا اس گھر بسی نے اے بہن
تلخ وشیریں ہو تو بولوں ماجرا
بات ہے باہر بیاں سے اسکی تو
بیاہ جب یوں ہی تمھارا ہوویگا
تم بھی تب یہ کھیل بھولوگی تمام
اصل کو پہچان لے تو نقل سے
کھیل گڑیوں کا ہے یہ دنیا سبھی
اب کسے اس کھیل میں رہنا ہی غرق
کھیل گڑیوں کا تو ہے یہ تب تلک
گڈے اور گڑیوں کا اب کس کو مزا
جب مجازی کا نہو یارا بیاں
گو مثل یہ ہے مجازی اے عزیز
تجکو اس عالم کی گر ہے آرزو

اور ہی شادی ہے کچھ غم اور ہے
کچھ خبر مسی سے اور کچھ تیل سے
لڑکیوں ہمجولیوں سے دور دور
جا کیا گوشہ میں اس سے یہ سوال
کیوں بھلایا کھیل کا وار ومدار
گم کیا جو کھیل کا سارا مزا
تلخ ہے شیریں ہے کہدے سربسر
بیاہ کہتے ہیں جسے وہ کیا ہے چیز
کہنے کے لائق نہیں ہے یہ سخن
جیبھ پر اس کا نہیں آتا مزا
جی ہی جانے ہے بیاں کچھ گو مگو
جب مزا معلوم سارا ہووے گا
اور ہی کچھ کھیل ہوگا والسلام
کر ذرا دریافت اسکو عقل سے
جب پڑے اس گھر میں تو جانے وہی
جھوٹ اور سچ میں سمجھ کتنا ہی فرق
گھر میں دولہ کے نجاوے جب تلک
کچھ کا کچھ یہاں کھیل اب ہے ہو گیا
پھر حقیقت کس طرح سے ہو عیاں
پر حقیقت کو یہیں سے کر تمیز
دین اور دنیا اٹھا رکھ ایک سو

کفر کافر را و دیں دیندار را — ذرۂ دردی دل عطار را
درد ہے اور درد ہے اور درد ہے — سب کچھ اس لذت کے آگے گرد ہے
جا مجازی میں قدم پہلے تو رکھ — پھر حقیقت کا مزا اس بعد چکھ
درد سے آگاہ پہلے ہو عزیز — پھر حق و ناحق کے غم کو کر تمیز
جا بتوں سے پہلے اپنا دل لگا — دیکھ تو کرتا ہے پھر کیا کچھ خدا
پہلے انکی دیکھ لے محبوبیاں — تا کہ ہوویں انکی ظاہر خوبیاں
بیوفائی انکی جب ہو آشکار — ان گلوں سے تیرا دل ہو تار تار
پھر سمجھ تو کچھ کہ دنیا کچھ نہیں — گرچہ ہے سب کچھ پر اپنا کچھ نہیں
سب سے کر دل خالی اور وہیں خدا — دل میں اپنے کچھ نہ لا غیر از خدا
دل ہے مرشد اور دل ہے راہبر — دل سے اپنے ہی رکھا کر کچھ خبر
سب تو اپنے دل سے باہر کر ہوس — یہ سخن رکھ یاد مجھ سے اور بس
سچ کہا ہے مولوی نے اے حسن — ہوش ہے تو گوش میں رکھ یہ سخن
گوش خر بفروش و دیگر گوش خر — این سخن باور ندارد گوش خر

سبب چھوڑنے ابراہیم ادہم کا سلطنت کو

بات آئی یاد اور عبرت فزا — اسکو لکھتا ہوں مفصل چند جا
تھا جو ابراہیم ادہم بادشاہ — صاحب تاج و سریر و عز و جاہ
مالک ملک بخارا و بلخ — حاکم افواج جوں مور و ملخ
دولت و حشمت ز اندازہ برون — کثرت اولاد ہم از حد فزون
دن کو صحبت با ندیم نامدار — رات کو خلوت میں اسکی گلعذار

کچھ نہیں اعدا سے رکھتا تھا خطر ‌ ‌ ‌ جس کو چاہے خود کرے زیر و زبر
اس عظیم السلطنت کو چھوڑ کر ‌ ‌ ‌ دشت پیماں کیوں ہوا دل توڑ کر
چھوڑ کر یہ اختیار و اقتدار ‌ ‌ ‌ گرد پا کیوں آپ کو خود خاکسار
کونسی دل کو لگی تھی اسکے چوٹ ‌ ‌ ‌ ہو گیا کس چوٹ سے دل لوٹ پوٹ
باعثِ آں بر سہ عنوان گفتہ اند ‌ ‌ ‌ ہر سہ عنوان در معنی سفتہ اند
تین ہی باتوں پہ حصر اسکا بیان ‌ ‌ ‌ کر گئے ہیں راویانِ باستان
ایک تھی سلطان ادہم کی کنیز ‌ ‌ ‌ باوفا و باحیا و باتمیز
ہر زمانہ دست بستہ باادب ‌ ‌ ‌ رہتی تھی خدمت میں شہ کی روز و شب
گرچہ وہ لونڈی تھی از بس عاقلہ ‌ ‌ ‌ پر کیا اکدن قضا نے غافلہ
از قضا کس را نباشد چارۂ ‌ ‌ ‌ این خطا سرزد ازاں بیچارۂ
تھا جو شہ کی استراحت کا پلنگ ‌ ‌ ‌ اسکے اوپر جا کے لیٹی بیدرنگ
چل رہی تھی اس گھڑی بادِ صبا ‌ ‌ ‌ اسپہ آخر نیند نے غلبہ کیا
خوابِ غفلت میں وہ ایسی آگئی ‌ ‌ ‌ کچھ نہ سدھ بدھ اپنے تن من کی رہی
لیکن اکدم بھر نہ سوئی تھی وہ آہ ‌ ‌ ‌ آن پہنچا سر پہ اسکے بادشاہ
این خطائے ناپسندیدہ چو دید ‌ ‌ ‌ از غضب لب زیر دنداں برگزید
حکم پھر ارباب خدمت کو دیا ‌ ‌ ‌ اس خطا کی جلد دو اس کو سزا
ہر طرف سے اسپہ گو پڑتی تھی مار ‌ ‌ ‌ مار پہ ہنستے رہی پر بے شمار
مار پر اس طور سے ہنستی رہی ‌ ‌ ‌ خندہ زن ہو جس طرح کبک دری
دیکھ کر یہ حال وردِ ہر زباں ‌ ‌ ‌ الاماں تھا الاماں تھا الاماں
شہ نے یہ طرفہ جو دیکھا ماجرا ‌ ‌ ‌ دل میں کہتا تھا کہ ہے کیا ماجرا
گفت آخر راست گوائے نیک زن ‌ ‌ ‌ در چنیں حالت چرائی خندہ زن

سچ بتا کیا دل میں تیرے ہے بھرا | مار پر ہنستی رہی کیوں برملا
ضرب جائی گریہ و غم دیدن ست | یا برائے بہجت و خندیدن ست
گفت شاہا بندہ ام فرمان پذیر | آنچہ سنجیدم بگویم ناگزیر
راستی کا وہ جو رکھتی تھی شعار | راست ہی اُسنے کیا یوں آشکار
اس بچھونے پر میں سوئی ایکدم | اسلئے کھینچے ہیں کیا کیا رنج و غم
جو کہ سویا ہوگا ہر صبح و مسا | حال اُس کا ہوگا کیا روز جزا
خواب یکدم داد برمن این تعب | وائے برآنکس کہ خوابد روز و شب
باعثِ خندیدنم این ظاہر ست | ورسرم خواہی تو اینک حاضر ست
شہ نے یہ عبرت زدہ سنکر بیاں | لی بگر انگشت حیرت در دہاں
پہلے اِن باتوں پہ شاباش کر گئی | پھر تو روئی اس قدر غش کر گئی
شاہ ادہم پر جو گذرا رنج و غم | کر نہیں سکتا ہے راقم کچھ رقم
بگذرد بر ہر کہ باید پرس ازو | دیگری ہرگز نگوید مثل او
روز آخر شد درین گفت شنفت | شب چو آید یک گل دیگر شگفت
باز وقتِ شب چو از غوغائے عالم | گشت فارغ آن شہ عالیمقام
قصرِ عالی استراحت کا جو تھا | لیگئے تشریف اس میں بادشا
ماجرائے روز سے تھا گو اداس | لیک اُس دم آگئی اُسکو نعاس
کچھ شکر خوابی تھی لیکن چشم وا | کان میں پہنچی کہیں آواز پا
غیظ میں آکر ہوا نعرہ زناں | کانپ اٹھا گویا زمین و آسماں
بعد اسکے پھر ٹہر کر لمحہ بھر | اُسنے للکارا برنگِ شیرِ نر
ہیں بگو تو کیستی اے مرد کا | چون نہادی تو قدم بر بامِ ما
عرض کی اُسنے کہ اے شاہِ جہاں | ہوں شتر گم کردہ پیرِ ناتواں

ڈھونڈھتا پھرتا ہوا میں اونٹ کو
بینم آخر تا چہ خواہد کرد گار
گفت خہ خہ عذر تو اے روسیاہ
یعنے تیرا عذر جو لایا ہے تو
کردہ باشی گم شتر در کوچہا
یا بیاباں میں ہوا مفقود اونٹ
تو کہ میجوئی شتر بالائے بام
ہیچ نشناسی تو از بالا و پست
گفت اے شہ ہوش کن چندین مجوش
بہر من صد طعنہ داری شہریار
آن زمان واقف شوی زعیب خود
یعنے منصف ہو کے سن سب گفتگو
آپ کو ہے حرص تخت و تاج کی
اشتہائے خوش غذا و آب یخ
اور تمنا گلرخانِ سیمبر
شوق داری با ظریفانِ جہاں
طامع ملک قم و قفچاق وقتے
بلکہ ہفت اقلیم کا سب بحر و بر
ہے ہوس یہ بھی کہ جب ہم ہوں سوار
سُم سے اُنکے خاک یا سرگین پلنگ
اور عمر خضر کا ہے اشتیاق

آن پہنچا یاں بھی بہر جستجو
یا بیابم یا نیابم زینہار
بدترین از بدترین است این گناہ
بدترین ہے جرم سے بھی حیلہ جو
جستجوئے میکنی بر بام ما
یا خیاباں میں ہوا مفقود اونٹ
ہیچ کس باور ندارد این کلام
اشترت را کس جسان اینجا بیست
منصفی شرط است بشنو دار گوش
خویش را دانا شماری شہریار
سر بیندازی اگر در جیب خود
پھر بتاتا ہوں راستی پہ میں کہ تو
آرزو ملک و خراج و باج کی
آرزوئے جامہ کمخواب و نخ
اور ہوائے گوہر و یاقوت و زر
ذوق داری با ظریفانِ زماں
طالب تسخیر روم و روس و رے
خواہش خاطر ہے پاؤں سر بسر
ہمرکاب خاص ہوں لاکھوں سوار
گرد اڑے سمجھے عبیر و بید مشک
غیر ممکن گو ہے اس کا اتفاق

ماسوا اس سب کے اور کتنے سو بھا … آگے میں کیا کہوں بجز ریش گاؤ
دل میں مجموعہ بھرا ہے حرص کا … چاہتے ہو اسمیں ملجائے خدا
دل پُر از حرص و ہوا و آرزو … گو کجا گنجد خدا را جستجو
حُب دنیاوی وحُب خدا … ہست زعمت پرخطا و پرخطا
مال و زر میں تو خدا کو پائے گر … میں بھی پاؤں گا شتر کو بام پر
گشت کارت گر بمقصودت تمام … مطلب من ہم بیابد انصرام
گر خدا خواہی تو در عیش و طرب … من شتر یابم بہ بامت چہ عجب
ہم خدا خواہی وہم مال و منال … این محالست این محالست این خیال
لیکن اے شہ تیری خاطر یہ دُعا … مانگتا ہوں اور مانگوں گا سدا
جبکہ ہووے جان شہ اس تن سے غیر … ہووے یارب خاتمہ شہ کا بخیر
اور خدا تیرا کرے انجام نیک … تا دو عالم میں ہو تیرا نام نیک
جب سنا شہ نے یہ سارا مدعا … اور اس سے گوش زد کی سب دعا
گفت شہ اے نیک و فرخندہ قدم … من مرید تو شدم تو مرشدم
از خطایم در گذر اے مرد پیر … دستگیری کن مرا شو دستگیر
این مثل مشہور ہست اے مرشدا … از بزرگان عفو و از خردان خطا
من از این دم روز ہر سو تافتم … یافتم تو آنچہ گفتی یافتم
پھر کہا دل نے کہ ہے کیا سوچتا … دوڑ جا پاس اسکے اسدم دوڑ جا
بیعت اس سے کیوں نہیں کرتا ابھی … اس سے بہتر پھر نہ پاوے گا کبھی
دست بیعت کو وہ شہ جسدم گیا … دیکھا کیا وہ شخص وانسے رم گیا
شاہ کا اب سر پٹکنا کیا کہوں … خوں کا آنکھوں سے ٹپکنا کیا کہوں
سانحہ اُس شب کا کھولوں کیا بھلا … شاہ پر گذرا سو بولوں کیا بھلا

گاہ در فریاد و زاری در گذشت | گاہ در اختر شماری در گذشت
ہوگئی القصہ ساری شب تمام | صبح کو تھا اور ہی کچھ انتظام
ہوگئی جب صبح صادق آشکار | شہ کے دل میں بسکہ تھا شب کا غبار
ناگہاں مرکوز خاطر یوں ہوا | جاکے بہلاؤں کہیں جی کو بھلا
پھر تو صحرا کی طرف وہ نامدار | جی کو بہلانے چلا ہو کر سوار
جب وہاں سے اسپ کو پھیری کی | راہ میں کیا دیکھتا ہے اس گھڑی
ایک اشتر فربہ و اعضا درست | پا کشیدہ خاک پر خوابیدہ سست
یعنی دیکھا اک شتر خوابیدہ واں | اور سرہانے اوسکے بیٹھا ساربان
شاہ دانست این شتر ہم زندہ است | ہم بقید زندگی خوابندہ است
نعرہ زد با ساربان کای قلتبان | زود تر از راہ اشتر را بران
یوں کہا اس نے کہ اے شاہ جہاں | ہو رواں جس سے شتر وہ ہے کہاں
وہ کہاں شئے جس سے تھا یہ راہرو | وہ کہاں شئے جس سے یہ کرتا تھا دَو
ہے نہیں کچھ اسمیں اب تاب و تواں | ہو نہیں سکتا ہے یہ ہرگز رواں
ہوگئے بیکار سب اس کے قوا | کب ہلا سکتا ہے اب یہ دست و پا
کیا کہوں حضرت سے اب میں اسکا حال | کر گیا ہے اس جہاں سے انتقال
الغرض تھی آئی اسدم اسکی موت | ہوگیا اکدم میں بیٹھے بیٹھے فوت
تا بمقدور اسکی کی میں نے دوا | پر کسی ڈھب سے نہیں پائی شفا
موت تو ہرگز نہیں درماں پذیر | جانتے ہیں اسکو سب برنا و پیر
موت کی جو شہ نے پائی آگہی | جان سے گویا ہوا قالب تہی
پھر تصور موت کا اپنی کیا | سامنے آکر بفرمان خدا
یوں کہا اسنے کہ ہوں میں عنقریب | جلد کر ساماں سفر کا اے غریب

موت سے جس دم سنا یہ برملا — تازیانہ ایک عبرت کا لگا
ادہم بیچارہ نے بس تیز گام — راہ صحرا لی چو اسپ بے لجام
جو ہوا اک دشت میں اسکا گذار — واں ہوئے دو دوست قدرت آشکار
الہم غیبی نے پھر یوں دی صدا — کہ ید اللہ فوق ایدیہم جو تھا
اس اشارے کا یہ ہے شان نزول — دست میں دے دست بیعت کر قبول
الغرض جب شاہ بیعت کر چکا — منکشف سب ہو گیا ارض و سما
در ہماں دم واصل اللہ شد — از رموز عارفاں آگاہ شد

پوچھنا کسی کا سبب ڈبونے مال کا اور جواب ابراہیم ادہم کا

کہتے ہیں ادہم ہوئے جس دم فقیر — چھوڑ سلطانی کا سب تاج و سریر
مال و زر جتنا خزانہ بیچ تھا — لیکے دریا میں دیا سارا ڈبا
پوچھا اک نے کیا کیا یہ اے ملک — کیوں نہ ہر اک کو دیا یہ اے ملک
درجواب اسکو کہا یہ مال و زر — مایۂ بغض و حسد نخوت کا گھر
یوں سنا میں نے بزرگوں سے کلام — جانتے ہیں اس مثل کو خاص و عام
آپ پر جو چیز ہووے ناپسند — غیر پر بھی اسکو مت رکھنا پسند
آنچہ بپسندی بخود اے شیخ دین — چون نپسندی بر برادر ہمچنیں
حظ اٹھا سکے تو اس نقل سے — عہد میں سلطان ابراہیم کے

حکایت ابراہیم ادہم و پیرزن گریاں

کہتے ہیں اک پیرزن تھی عابدہ — طاعت حق میں نہایت زاہدہ

یعنی خوں کی بندگی کرتی مدام ‏ ‏ اُس عبادت پر تھا رونا اوسکا کام

عجز سے اپنے کیا کرتی بکا ‏ ‏ اُسکے رونے سے اثر ہر دلپہ تھا

سن کے یہ احوال اُس کا بادشا ‏ ‏ ایکدن اسکی زیارت کو گیا

جانماز اوپر اُسے دیکھا کھڑے ‏ ‏ سر سے پا تک اشک کے موتی پڑے

جب عبادت سے ہوئی فارغ وہ زن ‏ ‏ شاہ نے اس سے کہا تب یہ سخن

اتنا تو رویا نہ کر اے پیرزال ‏ ‏ رحم کر آنکھوں کا اپنے دیکھ حال

گریہ رونا ہے تو پھر آنکھیں نہیں ‏ ‏ کر نہ دے نابینا آنکھوں کے تئیں

پیرزن نے جب سنی شہ سے یہ بات ‏ ‏ در جواب اُسکے کہا اے نیک ذات

چشم فردائے قیامت میں اگر ‏ ‏ دوست کا دیدار دیکھیں بھر نظر

تو تو کوری کا نہیں دنیا کے غم ‏ ‏ سہل ہیں یہاں کے یہ سب رنج والم

اور رہیں محروم اُس دیدار سے ‏ ‏ تو تو ہیں یہ رخنۂ دیوار سے

حشر میں گر منہ نہ دیکھیں یار کا ‏ ‏ تو تو اُنکا کور ہی رہنا بھلا

ایسی بینائی کسے درکار ہے ‏ ‏ ایسی بینائی سے دل بیزار ہے

چشم سے منظور ہے دیدار دوست ‏ ‏ ورنہ اک بادام کا سا یہ ہی پوست

سنکے ابراہیم ادہم بادشاہ ‏ ‏ دل میں یوں کہتا اٹھا یا الٰہ

شکر کرتا ہوں زمانہ میں مرے ‏ ‏ ایک اک ایسے بھی طالب ہیں ترے

طالب مولا حسن کیا لوگ ہیں ‏ ‏ ہیں وہ اعلیٰ اور ادنیٰ لوگ ہیں

اے برادر یکدم از خود دور شو ‏ ‏ با خود آ و غرقِ بحرِ نور شو

تو کہ یوسف نیستی یعقوب باش
ہمچو او در گریہ و آشوب باش

پوچھنا کسی کا حال اوقات گزاری کا جواب ابو الحسن خرقانی کا

ایک نے یہ بات پوچھی یار سے — نہ مجرد سے قبیلہ دار سے
بو الحسن خرقانی اُس کا نام تھا — فکر میں روزی کے بے آرام تھا
یعنی کیا ہے حال اور گذران اب — کس طرح کٹتی ہیں کہہ اوقات سب
بو الحسن نے یوں کہا تب بھر کے آہ — پوچھ مت بھائی مرا حال تباہ
وائے اُسپر اُس کا کہہ کیا ہوگا حال — جسکے ہووے گرد ان باتوں کا جال
فرض اپنا اک طرف چاہے خدا — واجب اور سنّت کو مانگے مصطفےٰ
اک طرف اطفال مانگیں آب و نان — اک طرف چاہیں فرشتے ہم سے جان
اسپہ گھٹتی جائے ہر دم عمر آہ — اور بڑھتا جائے ہر لحظہ گناہ
اس تشتت اور تفکر میں بھلا — کوئی آسودہ ہوا ہے دنیا میں کیا
فضل کیجو تو حسن پر اے خدا — ہے بہت نازک یہاں کا ماجرا

کنوئیں پر پیاسا رہنا ابرہیم ادہم کا اور سیراب ہونا ہرنوں کا

نقل ابراہیم ادہم کی مجھے — یاد آئی پڑھ سناؤں میں تجھے
فخر کے عالم میں تھا صحرا نورد — خاکساری میں رواں تھا مثل گرد
اک بیاباں میں لگی تھی اسکو پیاس — دور سے دیکھا کنواں اک کھیت پاس
کی نظر ادہم نے جو اُس چاہ پر — پانی کو دیکھا تو تھا وہ دور تر
واں نہ رسّی ہے نہ اُسپر ڈول ہے — ہے نہ لوٹا اور نا کچکول ہے
دلمیں یہ خطرہ پڑا ادہم کے تب — یعنی گر دلو اور رسن ہاتھ آئے اب

پھر تو ہم پانی کو لیں یاں سے نکال
ورنہ پانی یاں سے پینا ہے محال

یہ تو یاں چاہ کیئے دلو اور رسن
اک طرف سے آئے جو پیاسے ہرن

جو ہیں آئے اُس کنویں پر آہواں
وہیں پانی سے بھرا منہ تک کنواں

پی کے پانی وہ ہوئے سیراب جب
آسماں کو دیکھ کر بھاگے وہ سب

وہیں ابراہیم نے چاہا شتاب
اُس لبالب چاہ سے اب پیجئے آب

تھا جہاں آب آکے پھر واں رہگیا
ادہم بیچارہ حیراں رہ گیا

یوں کہا بیتاب ہو بازاری
ہووے ہرنوں کیلئے لبریز چاہ

اور ابراہیم کی خاطر وہ آب
جاوے یوں تحت الثریٰ کے تئیں شتاب

اتنے میں ادہم کو پہنچی یوں ندا
آہووں کا کب عقیدہ سست تھا

تھے کرم کے میرے وہ امیدوار
ڈول، رسی پر نہ تھا اُنکا مدار

تیری تو ڈول و رسن پر تھی نظر
لا کے رسی ڈول سے پانی کو بھر

آہووں نے کی تھی آ مجھ سے طلب
ڈھونڈھتا پھرتا تھا تو اُسکا سبب

جب ندا پہنچی یہ ابراہیم کو
مار کر نعرہ گرا بیہوش ہو

پس یہ لازم ہے سبھوں کو دوستاں
دی اگر توفیق خلاق جہاں

تو نہ رکھیں چاہیئے اہلِ مراد
غیر حق ہرگز کسی پر اعتقاد

آنا خوان کھانے کا ابراہیم ادہم کو پہاڑ پر

بادشاہت چھوڑ جب ادہم چلے
کوہ صحرا کی طرف کو شہر سے

بیٹے کو اپنا کیا قائم مقام
بادشاہت دہ لگا کرنے تمام

آپ لی پھر راہ صحرا کی غرض
مال دُنیا سے نہ کچھ رکھی غرض

ساتھ اک پیالہ لیا اور بوریا / اور اک مسواک اک تکیہ لیا

ایک سوزن خرقہ سینے کے لئے / بس یہ اسباب ضروری لے لئے

شہر سے باہر نکل جو کی نظر / سوتے دیکھا ایک کو واں خاک پر

بوریا پھینکا وہاں اور یہ کہا / خاکساروں کو زمیں ہے بوریا

آگے جا دیکھا تو اک بیچارہ آب / اوک سے پیتا ہے بیٹھا بے حجاب

ہاتھ سے پیالے کو بھی توڑا وہیں / یعنے پی لیوینگے ہم پانی یونہیں

آگے دیکھا ایک سوتا ہے غریب / ہاتھ کو رکھے سرہانے بے نصیب

تکیہ بھی چھوڑا فضولی جان کر / یعنے اک یہ بھی ہے مجھ پر بار سر

آگے جا کے دیکھا تو اک نیک خو / انگلیوں سے مانجتا تھا دانت کو

ہاتھ سے مسواک بھی تب پھینک دی / پاس اپنے ایک سوزن ہی رکھی

سیر کرتے کرتے اُس شہ کا گذر / ایکبیک اکدن ہوا اک کوہ پر

آدمی واں تھا نہ واں حیوان تھا / یا تو تھا وہ کوہ یا میدان تھا

دور سے اک جھونپڑی آئی نظر / دیکھا اک درویش کو اُس کوہ پر

کرکے عشق اللہ یہ بیٹھے وہاں / بیٹھنا شہ کا ہوا اُس پر گراں

بولا وہ درویش اے درویش تو / رات کو رہنا نہ یاں درویش تو

یاں نہ دانہ ہے نہ پانی ہے کہیں / مصلحت تیرا یہاں رہنا نہیں

تب یہ بولے اُس سے لے کم حوصلہ / رزق کا ہرگز نہ کر یو تو گلہ

تیرا میں مہماں نہیں اے تکیہ دار / جس کا مہماں ہوں وہی ہے غمگسار

جسنے دی ہے جان وہ دیویگا نان / گر نہیں باور تو کر لے امتحان

خواجہ پندارد کہ روزی وہ دہد / این نہ پندارد کہ روزی دہ دہد

جو کسی کے پاس آتا ہے عزیز / قسمت اپنی ساتھ لاتا ہے عزیز

ہے خدا سب کا نہیں کرتا شریک
رزق میں باہم کسی کو لا شریک

دیکھ آتے مت کسی کو سہم جا
اسکی قسمت کا ہے ساتھ اُسکے دھرا

کہکے یہ ہٹ اور وہاں سے جا رہے
سامنے تکیے کے جا ستا رہے

شام کو اک لوٹا اور دو روٹیاں
تکیہ والے پر وہاں کے اُتریاں

اور شنہ کے واسطے خوانِ طعام
اک پلاؤ کی رکابی ایک جام

ظرف چینی اور اُن پر خوان پوش
تھا تکلف سے بھرا سامان نوش

کھاکے ابراہیم نے پانی پیا
شکر نعمت کا پھر اک سجدہ کیا

یہ تو نعمت تیکے سب چلتے رہے
وہ جو تکیہ دار تھے جلتے رہے

شام جب آئی وہی پھر اُتریاں
ساتھ اک لوٹے کے واں دو روٹیاں

مارے غصّے کے انھوں نے یوں کہا
میں نہیں کھانے کا کھانا آپ کا

ایک کو تم بھیجو قلیہ اور پلاؤ
مجھکو جَو کی روٹیاں سوکھی کھلاؤ

جیسا وہ درویش ہیں درویش ہوں
جیسا وہ دلریش ہیں دلریش ہوں

کیوں بڑھائی ایک کی یہ عزّ و شان
ہیں فقیر آپس میں ہم سب ایکساں

جب کیا شکوہ یہ اُس نے آشکار
تب ہوا اُس پر خطاب کردگار

اے فقیر اتنا نہ بھول اپنے تئیں
تجھکو شرم اس بات پر آتی نہیں

اسکو گر پوچھے تو وہ تھا بادشاہ
میری خاطر تج دیا تاج و کلاہ

چھوڑ کر لذّات دنیا کی تمام
وہ شراب اور وہ کباب اور وہ طعام

وہ حکومت صاحبی سب اپنی چھوڑ
بندگی میں میری آیا ہاتھ جوڑ

صاحبی جو چھوڑ کر ہوئے غلام
کیوں نہ دوں میں اسکو اک خوانِ طعام

تیری اُس روٹی سے یہ کھانا ہے کم
یاد کر تو اُسکے وہ ناز و نعم

اور اپنا وقت بھی تو یاد کر
کس طرح اوقات ہوتی تھی بسر

ایک گھسیارا تھا تو مردِ غریب　　کھودتا تھا گھاس تو اے بدنصیب
جنگلوں میں کھودتا پھرتا تھا گھاس　　اک ٹکا آتا تھا اُسکا تیرے پاس
تو ہوا تھا چھوڑ کر اُس کو فقیر　　ماں نہ بیگم تھی نہ بابا تھا امیر
اس مشقت سے بسر کرتا تھا تو　　سر پہ گٹھے لیکے نت مرتا تھا تو
تجکو میں پکی پکائی روٹیاں　　بھیجتا ہوں ساتھ پانی کے یہاں
گر رضا پر میری تو راضی نہیں　　جا ٹھکانا اپنا کر یاں سے کہیں
دل فقیری سے اگر تیرا پھرا　　جا لے واں کھرپا وہ تیرا ہے دھرا
عاشقی سے تو ہماری باز آ　　لیکے کھرپا گھاس اپنی کھود کھا
جو خدا قسمت سے دیوے بیش و کم　　مت رضا سے اُسکی باہر رکھ قدم
ظرف سے اپنے نہ کر زاید طلب　　کھینچ مت بیفائدہ رنج و تعب
آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ　　بر نتابد کوہ را اک برگ کاہ
ناز را روی بباید ہمچو ورد　　در نداری گرد بدخوئے مگرد
اُسنے جو سمجھا ہے سو ہی خوب ہے　　طالبوں کو نت رضا مطلوب ہے
اپنے تئیں سب کے برابر تو نہ جان　　فہم کر یہ مولوی کی بات مان
کار پاکاں را قیاس از خود مگیر　　در نوشتن گرچہ ماند شیر و شیر
آن یکے شیرے کہ آدم میخورد　　واں یکے شیرے کہ آدم میخورد
ہم بھی ایسے ہیں نہ کہنا ہے برا　　عجز ہیں وہ آدمی گر ہے بھلا
یاں خودی ہیں اور خدا ہیں بیخبر ہے　　کس طرف بہکا پھرے ہے بیخبر ہے

حکایت تمثیلی

بات میں اک بات سنیو اور تو　　اِک سرہ پر تھی جا ئل آب جو

ایک نے چاہا کہ گھوڑا اسمیں ڈال — آپکو اُس آب سے لیوے نکال
جب لب جو پر غرض پہنچا سمند — چلتے چلتے ہوگیا واں آکے بند
کتنی ہی اُس کے تئیں مہمیز کی — اک قدم آگے نہ اُس نے خیز کی
جمع وہاں کتنے ہوئے یہ دیکھ حال — اتفاقاً گذرے اک صاحب کمال
تب انھوں نے یہ کہا اے مہربان — آپ کا گھوڑا نہ ہوگا یوں رواں
ریت یا کچّی لیکے اِس پانی میں تم — اس قدر ڈالو کہ ہووے عکس گم
الغرض یونہیں انھوں نے جب کیا — آب جو اوپر گذارا تب کیا
ایک نے پوچھا جو اُس کا ماجرا — بھید عارف نے یہ تب اُسسے کہا
آپکو یہ دیکھتا تھا جب تلک — پار ہو سکتا نہ تھا یہ تب تلک
جب خودی کی قید سے نکلا سمند — کھل گئے تب بند وہ تھا جس سے بند
حضرتِ یحییٰ پیمبر نے حسن — ڈھونڈ کر یکجا پہ لکھے یہ سخن
یعنے میں دیکھیں کتابیں دو ہزار — چار حرف اُنہیں سے رکھے یادگار
پہلے یہ تھا یعنے ایدل تو اگر — طاعتِ حق کو نہیں کرتا مگر
پھر نہ کھا روزی بھی اسکی تو مدام — لقمۂ طیب کے تئیں مت کر حرام
دوسرے حق نے کیا قسمت میں جو — صدق دل سے اپنے راضی اُسپہ ہو
ورنہیں ہوتا تو تو اپنا خدا — اور کرلے اور طلب کر اُس سے جا
تیسرے جو نہی فرمائی ہے بس — اُس سے تو باز آ نہ رکھ اُسکی ہوس
یا نہیں تو ملک سے اُسکے نکل — اس جہاں سے اُسکے باہر بیٹھ چل
بات چوتھی یہ ہے سن اے نفس آہ — گر کیا چاہے تو دنیا میں گناہ
تو کوئی ایسی جگہ کر لے تلاش — جس میں حق پر تیرا پردہ ہو نہ فاش
عیب گر کرتا ہے تو کر ایسی جا — جس جگہ دیکھے نہ تیرے تئیں خدا

پھر میں اب قصہ پر آیا اے حسن بیچ میں کہکر نصیحت کے سخن
کی جو اُس درویش نے یہ قیل و قال آیا تب اُسکے کمال اُوپر زوال
اُسکی خود بینی نے اُس کو کھو دیا حرص نے اُس کو کیا آخر ہوا
کاسۂ چشم حریصاں پُر نشد تا صدف قانع نشد پُر دُر نشد
جب کہ ابراہیم واں سے سیر کر کوہ سے میداں میں آئے اُتر
ایدھر اودھر پھرتے تھے جوں گردباد عشق کے وجداں میں ہو کر شاد شاد
ایک دن تھا اُن کا دریا پر گذر اتفاقاً اک وزیر آیا اُدھر
بادشہ نکلا تھا اُس کا ہو فقیر اس تجسس میں وہ پھرتا تھا وزیر
بیٹھے ابراہیم گدڑی اپنے ہاتھ سیتے تھے سوزن جو تھی وہ اُنکے ساتھ
تھا یہ ابراہیم ادہم کا وزیر اُسنے پہچانا کہ یہ جو ہے فقیر
ہو بہو میرا یہی ہے بادشاہ دوڑا اٹھکر روتا ہوا اک بھر کے آہ
پاؤں پر اُن کے گرا بے اختیار یوں لگا کہنے کہ شاہ نامدار
اب تلک حاضر ہے تیرا تاج و تخت اس فقیری سے گذر اے نیک بخت
وہ حکومت چھوڑ اور وہ صاحبی یہ گدائی کیا بھلی تجھکو لگی
تب یہ ابراہیم نے اُسکو کہا سلطنت میں ہے حکومت تیری کیا
ہے حکومت پر اگر غرّہ تجھے تو سوئی دریا سے منگوا دے مجھے
کہکے پھر دریا میں سوزن پھینک دی اور کہا منگوا دے تو مجھکو سوئی
کتنے ہی ملاح اُس نے جمع کر اُن کے دینے کو دکھایا مال و زر
یعنی لے آوے سوئی دریا سے دو مانگے جو کچھ مجھسے میں دوں اسکو سو
سیکڑوں ملاح سر پٹکا کئے تنکے تنکے پر غرض اٹکا کئے
جوں حباب آنکھیں لگا دریا کے ساتھ سب نے دیکھا پر سوئی آئی نہ ہاتھ

اُس سرشتے سے الگ سب رہ گئے
جاؤ جو جو دلمیں تھے سب بہہ گئے

جب ہوا عاجز وزیر اور منفعل
بیوقوفی سے بہت اپنے خجل

تب تو ابراہیم ادہم نے کہا
تو نے دیکھا حکم کا اپنے مزا

اب حکومت پہ ہماری سیر کر
کیونکر آتی ہے سوئی یاں تیر کر

مچھلیوں سے پھر کہا اے مچھلیو
یاں سوئی میری گری ہے لاکے دو

منھ میں اپنے رکھ کے وہ سب لائیاں
سونے روپے کی بہت سی سوئیاں

تب کہا انہیں تو ہے رنگ دوئی
مجھکو ہے درکار اپنی اک سوئی

ایک مچھلی نے غرض سوزن دہی
لاکے ابراہیم کے آگے دھری

تب کہا دیکھی ہماری سلطنت
اے وزیر اس بات کو پھر کھو مت

بادشاہت پر ترے اے بیخبر
جاوے کون اس سلطنت کو چھوڑ کر

حاضروں نے جب یہ دیکھا ماجرا
صورت دیوار ہر اک ہو گیا

پھر کہا ششدر رہو کیوں اے دوستو
اس تماشے کا اچنبھا مت کرو

حکم میں خالق کے جو کوئی رہا
حکم میں اسکے ہوا ارض و سما

چون از وکشتی ہمہ چیز از تو گشت
چون از وکشتی ہمہ چیز از تو گشت

کر کے حاصل یہ جواب بے نظیر
پھر گیا اقلیم کو اپنے وزیر

رخصت کرنا ابراہیم ادہم کا بیٹے کو

ایک دن بیٹا انھوں کا ہو اداس
ملنے کو الفت سے آیا باپ پاس

اُن کے بھی دلمیں محبت آ گئی
دیکھ کر بیٹے کو الفت آ گئی

دو نہیں اک الہام غیبی یوں ہوا
یعنی ابراہیم تو سمجھا ہے کیا

یا تو بیٹے ہی کی الفت دلمیں رکھ — یا ہماری ہی محبت دلمیں رکھ
دل ہے تیرا ایک اُسمیں اے حزیں — الفتیں دو دو سما سکتی نہیں
ہووے جس دلمیں مری الفت کی جا — غیر کی الفت کا اُسمیں کام کیا
سنکے یہ حق کی طرف ہاتھ اپنے جوڑ — سب کی الفت سے غرض منہ اپنا موڑ
وونہیں اُس بیٹے کو رخصت کر دیا — کر کے توبہ پھر یہ رو رو کر کہا
دین ہمہ گر رفت گو رو باک نیست — تو بمان اے آنکہ چون تو پاک نیست
اسکو الفت کہتے ہیں اے بوالہوس — عشق جس کا نام ہے سو یہ ہے بس
اس حسن کو آہ اپنا عشق دے — عشق دے اللہ اپنا عشق دے

درویشی اختیار کرنا فرید الدین عطار قدس سرہ کا

نقل ہے گر عارفوں کے ہے مزا — سنیو ٹک کہتا ہوں اُنکا ماجرا
وہ فرید الدین جو عطار تھے — باپ کی دوکان پر مختار تھے
باپ اُنکا اُس جہاں سے پیشتر — اُٹھ گیا تھا یہ تھے اُنکی جائے پر
کتنے خدمتگار تھے چالاک چست — دست بستہ کام میں اپنے درست
سیکڑوں تھیلے دواکے تھے دھرے — سیکڑوں شربت کے شیشے تھے بھرے
مال و زر سے تھی بھری ساری دوکان — اس تجمل سے وہ بیٹھے تھے وہاں
ناگہاں ظاہر تو اک مجذوب سا — لیک باطن میں وہ سالک خوب سا
گرچہ صورت میں وہ دیوانہ سا تھا — لیک سیرت میں وہ فرزانہ سا تھا
سیر کرتے کرتے ادھر آن کر — ایکدم ٹھہرا وہ اُس دوکان پر
ٹھہر کر ایسا وہ کچھ بے اختیار — دیکھنے لاگا دکاں کو بار بار

اشک حسرت اپنی آنکھوں بیچ لا — آہ درد آلودہ بھر کر تک رہا
تب فریدالدین نے اُسکو دیکھ کر — یوں کہا کیا دیکھتا ہے بے خبر
چل رے آگے چل کھڑا ہی کیوں یہاں — جس طرف جاتا ہے جلدی جا وہاں
تب کہا اُسنے کہ ادھر کر نگاہ — میں چلا میری تو ہے یہ شاہراہ
تیرے چلنے میں تو کب تاخیر ہے — میں سبک سر رہ ہوں مجھے کیا دیر ہے
میں سبک بار اسقدر ہوں اے عزیز — غیر خرقہ کچھ نہیں مجھ پاس چیز
ایک تو اور اتنے شیشے تیرے پاس — کام یاں ہرگز نہیں کرتا قیاس
تو خلیطے لے کے اور یہ تھیلیاں — کس طرح پہنچیگا جلدی اے میاں
لے خبر اپنی تو اے پابند زر — کب ترا منزل تلک ہوگا گذر
شہد و شربت میں پڑا ہو جوں مگس — تجھ میں اُڑنے کی نہ قوت ہے نہ بس
کہکے یہ اور زیر دوکاں لیٹ کر — لیکے پھر خرقے کا دامن منہ اوپر
نعرۂ ہو کہہ کے مسافر ہوگیا — اُسکا مرنا دم میں ظاہر ہوگیا
دیکھا جب عطار نے یہ ماجرا — اس حقیقت سے اثر دل پر ہوا
جنس و اشیا اپنی سب برباد دے — اک فقط جامہ ہی اپنا ساتھ لے
یاد کر مجذوب کے وہ قیل و قال — چھوڑ کر دوکان اور دُنیا کا مال
جیسا بازاری تھا بیزاری ہوا — اس جہاں سے اُسکا دل بھاری ہوا
دوسری یہ بھی روایت ہے صحیح — یوں بھی کہتے ہیں حکایت ہے صحیح
ایک ہی مضموں ہوا جو آہ یوں — یعنی دوکاں پر فقیر آیا وہ جوں
کہنے لاگا بارے ہاں اے بیخبر — نام اللہ ایک کوڑی دے ادھر
دی صدا عطار نے یہ اُسکی ٹال — پھر کیا کوڑی کا اُسنے تب سوال
پھر نہ بولا وہ تو اُسنے پھر کہا — سنکے نہیں پر بھی وہ سُن ہی ہو رہا

کچھ بھی اودھر سے نہ پایا جب جواب — تب کہا درویش نے یوں کر خطاب

ایک کوڑی نام پر حق کے نہیں — دیگا جی کیونکر فرشتے کے تئیں

تب کنائے سے وہ بولے اسطرح — آپ اپنی جان دینگے کس طرح

جب سنی درویش نے یہ اس سے بات — دھر کے پیالا سر تلے اور منہ پہ ہات

بولا ایدھر دیکھ میں یوں جی دیا — تو بھی دے جی آ سکے ایدھر تو بھی آ

ورنہ تو شہد و شکر میں رہ پڑا — تجھکو اس لذت سے میریجان کیا

وہ تو جی دیکر اودھر کو ڈھل گیا — انپہ عالم اور ہی کچھ کھل گیا

کیا دوا کیا شیشہ اور کیسی دکان — انکی بھاویں منگیا سارا جہان

اسکے جی جانے پہ انکا دل گیا — اس طرف ٹوٹا اودھر کو مل گیا

اس طرف سے ہو کے جیوں کافور سرد — ترک سب اپنے تئیں وہ نیک مرد

ملک عرفاں کی طرف عازم ہوا — شیخ رکن الدین کا جا خادم ہوا

رفتہ رفتہ پھر تو وہ کامل ہوا — درد میں حق کے سراپا دل ہوا

عارفوں کی بات سنتا رہ حسن — تجھکو یہ شاید اثر بخشے سخن

شہد و شربت سی نہیں یاں ہی مراد — الفت فرزند و زن رکھ اسکو یاد

الفت فرزند و زن زنجیر ہے — اسلئے چلنے میں تجھکو دیر ہے

پر اسے کہتا نہیں میں چھوڑ دے — شرع کے رشتے کو تو مت توڑ دے

کیونکہ ہے دنیا کا یاں یوہیں رواج — رہ انھوں میں پر بقدر احتیاج

جیوں مرض کے واسطے کوئی دوا — کام میں لاتا ہے تو بھی ان کو لا

اپنا دل مت باندھ انسے میریجاں — وقت چھٹنے کے نہ گذرے تا گراں

کیونکہ جتنی وصل میں لذت اٹھائے — وہ ہی لذت ہجر میں آفت دکھائے

اتنی رکھ الفت کہ گر وقت رحیل — چھوڑ دے انکو تو ہووے کچھ نہ ذلیل

اس جہاں کو تو سمجھ مثلِ سرا — اس سرا میں تو نہ اپنا دل لگا
ایک شب کا ہے گذارا اس جگہ — رہ مسافر بنکے تو اے مردِ رہ
اس سرا کا چھوڑنا منظور رکھ — دل لگانا عقل سے یاں دور رکھ
کیونکہ ان فرزند و زن کو کر قیاس — اہلِ مجلس کی طرح سے شمع پاس
تجھ میں جب تک روشنی ہے اور نور — تب تلک تجھ پاس ہے ان کا ظہور
روشنی اور نور خدمت ہے تری — انکو اس خدمت سے الفت ہو تری
پہنچی جب سر پر ترے صبحِ اجل — حس و حرکت میں پڑے اسکی خلل
جسم کی یہ شمع جب ہو گل تری — رُوح نکلے گل یہ ہو بلبل تری
تجھکو پھر جیوں شمعِ کشتہ بوجھ کر — گھر سے لیجا کے رکھے بیرونِ در
تجھسے پھر ہرگز نہ رکھیں کام وہ — بلکہ لیویں بھی نہ تیرا نام وہ
بس یہ اپنے کام سے رکھتے ہیں کام — نام کو رکھا ہے تیرا خواجہ نام
تو بھی اپنے کام تک رہ آشنا — خود غرض جو ہوں نہ اُنسے دل ملا
دل ملا ایسے سے اے شوریدہ سر — جسکی الفت دے سدا تجھ کو ثمر
بات پر وو دن کی مت مغرور ہو — اُس سے ہو نزدیک سب سے دُور ہو
اور سب دو دن کے ہیں یہ دوستدار — اول و آخر وہی ہے تیرا یار
تو مگو مارا بدان شہ بار نیست — با کریماں کارہا دشوار نیست
عشق آں حق راگزیں کو باقی است — کز شراب لایزالی ساقی است
لیک تو خفیہ بشکل با ادب — سوی او مغز آرد او رامی طلب
دل لگا اپنا خدا سے میری جان — اُس سوا ہے کون تیرا مہربان
اے حسن تو جان یہ غیر از خدا — یاں نہیں کوئی کسی کا آشنا

ہنسنا اکبر بادشاہ کا جواب ملک محمدؐ جائسی کا

تھے ملک نامِ اک محمدؐ جائسی — وہ کہ پدماوت جنھوں نے کہی

مردِ عارف تھے وہ اور صاحب کمال — اُنکا اکبر نے کیا دریافت حال

ہوکے مشتاق اُن کو بلوایا شتاب — تاکہ ہو صحبت سے انکی کامیاب

صاحب باطن تھے وہ مستِ الست — لیک دُنیا تو یہ ہے ظاہر پرست

تھے بہت بدشکل وہ اور بدقُوا — دیکھتے ہی اُنکو اکبر ہنس پڑا

جو ہنسا وہ تو اُنھوں نے دیکھکر — یوں کہا اکبر سے ہوکر چشم تر

ہنس پڑے ماٹی پہ تم اے شہریار — کُمھرو اپر ہنسے بے اختیار

کچھ گنہ میرا نہیں اے بادشاہ — سُرخ باسن تو ہوا اور ہیں سیاہ

اصل میں ماٹی تو ہے سب ایکذات — اختیار اُسکا جو ہے سو اُسکی ہات

کوئی دن کے رنگ کوئی رات کے — رنگ ہیں دونوں یہ اسکے ہات کے

سنتے ہی یہ حرف رویا اور گر — گر پڑا اُن کے قدم پر آن کر

الغرض اُن کو باعزازِ تمام — اُن کے گھر بھجوا دیا پھر والسلام

صاحبِ تاثیر جو ہیں اے حسن — دل پہ کرتا ہے اثر اُن کا سخن

سمجھانا درویش کامل کا شہزادے کو

ایک شہزادہ سلاطینوں سے تھا — چاہتا تھا فقر سے ہو آشنا

بیٹھتا تھا جاکے درویشوں کے پاس — پر وہی رکھتا تھا شاہانہ لباس

دلمیں تھی کچھ سلطنت کی بھی ہوس — گو کہ کہتا تھا کہ دنیا ہے قفس

عہد میں تھا اُسکے اک صاحب کمال — اُنکی خدمت میں یہ تھا اُسکا سوال
یعنے کھینچو مجھ کو تم اپنی طرف — پُر گُہر کر دو مرا دل چوں صدف
اس توقع پر وہ جاتا تھا ہمیش — پر نہ جانی تھی نہ کچھ اُسکی بات بیش
ایکدن گھبرا کے اُس سے یہ کہا — اب تلک حضرت نہ کچھ حاصل ہوا
تم سے میں صاحب کمالوں سے ملا — پر نہ میرا غنچۂ مقصد کھلا
سُنکے اُس عارف نے دی بات اُسکی ٹال — بعد کئی دن کے کیا اُس سے سوال
یعنی اے شہزادۂ بیدار بخت — اک چنبیلی کا ہے اُس جا پر درخت
اسکے پات اور پھول باہم اے جواں — توڑ کر دونوں کو تو لے آ یہاں
سُنکے اُس درویش سے وہ نیکذات — کر اکٹھے توڑ لایا پھول پات
تب کہا تو اُسکو لیجا اپنے گھر — رات کو رکھ کر لے آ وقت سحر
لیکے دونا دونہیں رکھکر اُسکو رات — پھر لے آیا صبح کو وہ نیکذات
تب کہا درویش نے اب کر قیاس — دیکھ تو کیسی ہے ان پتوں میں باس
سونگ کر اُسنے کہا اے نیک خو — اب تو ان پتوں میں ہے پھولوں کی بو
پھر کہا اب جا شجر کے سونگھ پات — پھول ہیں آخر یہی اُنکے بھی سات
واں بھی اُسنے کی جو کیفیت قیاس — پائی اُن پتوں میں پتوں ہی کی باس
عرض کی پھر آن کر اے حق گزیں — اُنمیں اُن کی بو ہے پھولوں کی نہیں
تب کہا درویش نے اے میری جان — ہے یہ پتے کی بات سُن سبکا بیان
وہ جو پتے ہیں شجر میں بر ملا — جڑ سے ہے انکا رگ و ریشہ ملا
شاخ و بن ہی میں وہ اپنے ہیں نہال — انکو ہے صحبت کا گل کے کب خیال
اپنی سرسبزی پہ وہ مغرور ہیں — جتنے ہیں نزدیک اتنے دور ہیں
اور پتے شاخ و بن سے ٹوٹ کر — ہو غریب اپنے وطن سے چھوٹ کر

آملے پھولوں میں تب لیسے ہوئے | جیسے گل تھے آخرش ویسے ہوئے
تیری تو جز سلطنت میں ہے لگی | تجھکو درویشوں سے ہو کب ہمسری
تو بھی اپنی سلطنت کی جڑ کو توڑ | الفت شاخ و شجر سے منھ کو موڑ
ٹوٹ کر مل کاملوں سے اے پسر | تو تجھے صحبت کا اُنکی ہو اثر
یوں ملا گر تو تو اس ملنے سے کیا | گر ملا چاہے کسی سے دل ملا
رو تبر برگیر و مردانہ بزن | تو علی وار این درِ خیبر مکن
ورنہ چون فاروق و صدیق ہیں | رو طریقِ دیگران را بر گزین
رو قیامت شو قیامت را ببین | دیدنِ ہر چیز را شرط است این
مل فقیروں سے حسن ہو کر فقیر | مل امیروں سے حسن ہو کر امیر

خط نصیحت آمیز یحییٰ درویش کا در جواب خط بھائی کے

مرد عارف ایک یحییٰ نام تھا | بھائی نے کعبہ سے اسکو خط لکھا
یعنی اے بھائی مجھے تھی آرزو | ان کئی باتوں کی تھی جستجو
پہلے تو یہ تھی تمنّا سچ کہوں | بہترین شہر میں جاکر رہوں
تو خدا نے کعبہ مقصد دیا | اسپہ واجب سجدۂ شکرِ خدا
دوسرے میں چاہتا تھا اک کنیز | باسلیقہ با وقوف و باتمیز
سو خدا نے خادمہ ویسی ہی دی | جسکی خدمت سے عبادت میں نے کی
تیسرے اک آرزو باقی ہے یہ | دل میں اس حسرت کی میرے ہے گرہ
جیتے جی اکبار میں دیکھوں تجھے | دیکھنا تیرا میسر ہو مجھے
آرزوئیں بس ہوئیں اس پر تمام | مدعا باقی نہیں اب والسّلام

پہنچا یہ نامہ جو بھیجے اُسکو شتاب — یوں لکھا اک نامہ اُسکے در جواب

یعنی اے بھائی اگر ہے تجھمیں ہوش — رکھیو ان باتوں پہ میری لیسے گوش

بہترین شہر پایا تو نے گو — چاہیے تو بہترین خلق ہو

ہے بزرگی شہر کو مردوں سے یا — فخر ہے مردوں کو شہروں سے بھلا

ہے مکیں ہی سے مکانوں کو شرف — قرب گوہر ہی سے اچھی ہے صدف

شہر ہے کیا چیز تو ہو آپ چیز — جس جگہ جائے تو پھر واں ہو عزیز

دوسرے گر مردمی ہوتی تو تو — خادم حق کی نہ کرتا آرزو

اپنا خادم خادم حق کو نکر — اس خیال خام سے تو درگذر

خادمی درکار ہے بھائی تجھے — نہ کہ مخدومی یہ کیا بھائی تجھے

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد — آنکہ خود را دید او محروم شد

ہے صفت مخدومی اس معبود کی — خادمی ہے بندۂ نابود کی

وہ جو ہے حق کی صفت اُسکے تئیں — چاہنا بندہ کو ہے لائق نہیں

تیرے گر دیکھنا مد نظر — ہے مرے دیدار کا اے بیخبر

تو تو دعویٰ عاشقی کا خام ہے — عاشقی سے تجھکو پھر کیا کام ہے

گر خدا سے کچھ خبر ہوتی تجھے — یاد ہی لاتا نہ تو ہرگز مجھے

رہ خدا کی یاد میں اسطرح شاد — تا کوئی بھائی نہ آوے تجھکو یاد

اے برادر اُسکو گر پایا غرض — مجھسے پھر باقی رہی کہہ کیا غرض

اور نہ پایا جب نشاں اُس یار سے — فائدہ کیا پھر مرے دیدار سے

وہ اگر ہے یار تو سب یار ہیں — ہے اگر وہ غیر سب اغیار ہیں

آرزو رکھے تو رکھ اللہ کی — ہے یہی اک بات سب میں راہ کی

دھیان رکھ اللہ سے تو اے حسن — بھول جا دنیا کے سب رنج و محن

حکایت حضرت جنید بغدادی قدس سرہ

تھا کوئی بغداد میں صوفی عبید
آئے اُسکے خواب میں اکدن جنید

پوچھا اُنسنے یوں کہ کہہ اے نیکنام
تو نے پہنچایا کہاں تک اپنا کام

عالمِ بالا کی کہہ کیسا سیر ہے
یہ تو ہم سے کہہ وہاں تو خیر ہے

تب کہا اُس مردِ عارف نے کہ آہ
ہے نہایت صعب اُس میداں کی راہ

کار عقبیٰ کا ہے اُس سے بیشتر
جو گماں کرتے تھے واں ہم اے پسر

محرمِ این ہوش جز بیہوش نیست
مر زباں را مشتری جز گوش نیست

فی المثل اکبات یاد آئی ہے اور
کیجیو اُس بات پر تو میری غور

حکایت بر سبیل تمثیل

ایک صالح مرد تھا کوئی کہیں
کچھ غرض درپیش تھی اُسکے تئیں

بیچنے کو اُسنے نقرہ جمع کر
گھر میں اپنے تولا اک دینار بھر

تول کر بازار میں جب لیگیا
جتنا تولا تھا نہ واں اُتنا ہوا

اُس سے کم نکلا کیا تھا وزن جو
دیکھ اُس صورت کو اور حیران ہو

خوب رویا درد سے وہ با تمیز
پوچھا اُس سے کیوں تو روتا ہے عزیز

تب کہا اُسنے کہ ہے رونے کی بات
تو نہ سمجھا اتنک اے نیکذات

ق

آج گھر کی بات باہر سچ نہیں
بات دُنیا کی بھلا کل کے تئیں

راست ہوگی آخرت میں کس طرح
یاں کا تو احوال دیکھا اسطرح

بس جو کچھ کرتے ہیں ہم یاں سے کہاں
کس نے دیکھا ہے کہ یوں ہوگا وہاں

ایسے اعلاؤں کا جب یہ حال ہو
ہم سے ادناؤں کا کیا احوال ہو

فضل اُس کا ہو حسن تو نوچھیٹیں
اور جو اُسکا عدل ہو تو بس لٹیں

حکایت طالوت و جالوت و مطابقت آن با اہل دنیا و عقبیٰ

یوں سُنا ہے قصّہ طالوت ایک
بعد موسیٰ تھا کوئی جالوت ایک

عاد کی تھا قوم سے وہ بت پرست
پایا اسرائیلیوں پر اُسنے دست

ملک کو اُن کے کیا تھا بے چراغ
تھا دل اسرائیلیوں کا داغ داغ

عہد وہ شمویل پیغمبر کا تھا
اُس زمانے میں وہی تھے پیشوا

ایکدن ملکر سبھوں نے یوں کہا
اپنے پیغمبر سے جا کر کہہ سُنا

حکم لو حق سے کہ ہم میں بادشاہ
ایک ہو جاوے تو پھر ہم سب سپاہ

راہ میں حق کی کریں چلکر جہاد
اُس سے جو جالوت ہے از قوم عاد

الغرض اُنکے یہ جب مدعا
مانگی پیغمبر نے جب حق سے دعا

ایک کاسہ واں سے روغن کا بھرا
اور عصا اک لا فرشتوں نے دھرا

اور کہا ہے یوں ہے اب حکم خدا
حق نے بھیجا ہے یہ روغن اور عصا

ملکے سب اُس کاسہ روغن کے پاس
ایک ایک آویں رکھیں اُس پر قیاس

جس کے آنے سے یہ روغن جوش ہو
بادشاہت اُسکو تم سب ملکے دو

دوسری یہ ہے نشانی برملا
جسکے قد کے ہو برابر یہ عصا

امتحاں جب کر چکیں اسکا تو سب
حکم میں اُسکے رہیں ہے حکم رب

یہ خبر سنکر سبھی چھوٹے بڑے
پاس اُس پیالے کے سب آنے لگے

ہوتے ہوتے ایک سقّا شہر کا
پاس اُس پیالے کے جو نہیں گیا

جوش کھا کر نیل اوپر آ گیا | اور عصا قد کے برابر آ گیا
یہ وہ سقا اُس کا تھا طالوت نام | جانتے تھے اسکو سب اونے تمام
دم میں اونے سے کیے اعلیٰ خدا | ہے برابر اُسکے ہاں چھوٹا بڑا
نیک و بد کی کچھ نہیں بابت رہی | جسکو پی چاہے سہاگن ہے وہی
جب یہ دیکھا معجزہ سب نے حسن | تب پیمبر سے لگے کرنے سخن
یہ تو سقا ہے بچارہ اک غریب | ہم کریں اُسکی اطاعت ہے عجیب
ہم کو اسکی بادشاہت تب قبول | جب علامت اور بھی ہو یا رسول
پھر خدا سے عرض کی بارِ الٰہ | اور حجّت چاہتی ہے یہ سپاہ
یوں ہوا پھر حکم تب بار دگر | تھا جو تابوتِ سکینہ پیشتر
پاس اُن کے جس سے اُنکی فتح تھی | لیگئے تھے چھین اُنسے مدعی
ہم اُسے پھر اُن سے ڈھونڈھینگے منگا | تب تو سمجھیں گے یہ غافل مدعا
کیا ہے تابوتِ سکینہ اے عزیز | تھا وہ اک صندوق اسکو کر تمیز
اسمیں تصویریں تھی اُنکی سر بسر | گذرے تھے جتنے پیمبر پیشتر
اور تھے کتنے تبرک ماسوا | یادگار انبیا و اولیا
جب فرشتوں کو ہوا حکمِ خدا | لائے تابوتِ سکینہ وہ اٹھا
لاکے اسرائیلیوں میں دھر دیا | دیکھ کر سب نے تعجب تب کیا
بولے پیغمبر کہ اب لو یہ دلیل | اب تو بس مانو گے تم حکمِ جلیل
سب نے پھر خوش ہو کے آمنّا کہا | اور لگے کہنے کہ اب مقصد ملا
حکم میں طالوت کے آئے تمام | ساتھ اُسکے ہو کے نکلے خاص و عام
یوں حکایت ہے کہ جب ستر ہزار | ملکے گرویدہ ہوے پیادے سوار
امر پیغمبر سے یا از حکمِ رب | یوں کہا طالوت نے اُن سبکو تب

یعنے اے قوم اسکو جانو برملا ۔ آزمائیدہ تمہارا ہے خدا

اس ہوائے گرم میں ہوگا سفر ۔ نہر اک جاری ملے گی پیشتر

تشنگی تم سب کو ہووے گی کمال ۔ آپ کو اس آب سے رکھنا سنبھال

نیک و بد کے امتحاں کی ہے وہ جا ۔ دوست دشمن تا کرے ظاہر خدا

ایک چلو کے سوا جو واں سے آب ۔ پیویگا بیشبہہ وہ ہوگا خراب

پیویگا پانی زیادہ واں سے جو ۔ میرے دیں سے وہ نہوگا جان تو

اور میں جتنا کہا ہے اتنا کر ۔ ہوویگا تو وہ رہے گا باخبر

الغرض ظاہر ہوئی وہ نہر جب ۔ پی گئے اکثر انھوں سے تشنہ لب

یعنے جو ثابت قدم تھے دیندار ۔ ایک چلو پر کیا آخر قرار

پیشتر جو پی گئے تھے سب کے سب ۔ وہ تڑپتے رہ گئے اور خشک لب

وہ جو قانع تھی بجھی اونکی پیاس ۔ بلکہ پانی بچ رہا کچھ اُنکے پاس

وہ جو تھے کمخوار سو تو رم گئے ۔ جو زیادہ خوار تھے سو جم گئے

کاسۂ چشم حریصاں پُر نشد ۔ تا صدف قانع نشد پر دُر نشد

چاہتے تھے وہ کہ پانی بھی پئیں ۔ اور راہِ حق میں ثابت ہو جئیں

یہ غلط خطرہ تھا اول کا مہرباں ۔ دین کو دنیا کو ڈھونڈیں سو کہاں

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں ۔ این خیالست و محالست و جنوں

الغرض وہ تین تیرہ ہو جواں ۔ حکم کے تابع جو تھے پہنچے وہاں

آخرش نکلا بہت تھوڑوں سے کام ۔ فتح کی لڑکر انھوں نے والسلام

جب پھر الطالوت وانسے فتح کر ۔ نہر پر وہ جو پڑے تھے تشنہ تر

جز ندامت کچھ نہ آیا اُنکے ہاتھ ۔ آبرو اُنکی گئی پانی کے ساتھ

اہل عرفاں نے یہاں سے اے حسن ۔ کیا مثل دی ہے ذرا سنیو سخن

رمز اس قصے میں ہے اے نیک ذات / سنیو اسکو معرفت کی ہے یہ بات

تھا وہ جو طالوت اُسکی قوم بھی / سالکوں سے اُسکو ہے تشبیہ دی

اور وہ جالوت جو گمراہ تھا / نفس بد سے ہے مثل اُسکو دیا

نہر دنیا اور پانی اُس کا زر / عارفوں نے اُسکی یوں دی ہے خبر

تجکو خطرہ اُس سوا ہرگز نہیں / تجھکو یہ پانی نہ لیجاوے کہیں

وہ جو سالک ہیں سو وہ بیباک ہیں / ہیں اسی میں اس سے یہ بیباک ہیں

کیونکہ وہ پانی کو اپنے منہ تلک / پہنچنے دیتے نہیں لاریب و شک

بلکہ منہ سے دور کرتے ہیں وہ آب / پیٹ کو رکھتے ہیں خالی جوں حباب

پیتے ہیں اتنا نہ ہو جس سے ضرر / گر نہیں پڑتے وہ پانی دیکھکر

تب سکر و ہو کے وہ چشمک زناں / ایک جھپکی میں پہنچتے ہیں یہاں

یعنی اپنی اصل میں جاتے ہیں مل / بلبلے کی طرح ہو کر صاف دل

تو نہ لہرا دیکھ اُس کی لہر سے / روز و شب خطرہ میں رہ اس نہر سے

مت رکھو اس پانی کی تو افزوں ہوا / راس پانی کی کچھ نہیں آب و ہوا

سالکوں کی پیروی میں رہ مدام / حکم میں تو اُنکے رہ اے نیکنام

تو تو نفس بد پہ قادر ہو ویگا / ورنہ تو مغلوب کافر ہو ویگا

لے موافق ظرف کے تو یاں سے آب / ورنہ ڈوبے گا تو اور ہوگا خراب

گر بمقدار خورش تو لیوے گا / حق تعالیٰ صبر تجھکو دیوے گا

شام تیری جلد ہو وے گی صباح / صبر کو کہتے ہیں مفتاح الفلاح

بس تو اپنے روز و شب ہی لے خبر / جس طرح ہو یاد حق میں کر بسر

جتنی دنیا کی رکھے گا دلمیں چاہ / اتنا تو غافل رہے گا اور تباہ

جمع جیوں جیوں تو کرے گا مال و زر / حرص تیوں تیوں تیری ہوگی بیشتر

جس طرح پانی کے اوپر ہی مثل — ہے اسی ترکیب سے یاں کی مثل
ماجرا طالوت اور جالوت کا — اپنے ہی احوال پر گویا ہوا
حرص کو دشمن اگر رکھے گا تو — دوستانِ حق میں ہوگا سرخرو
حق سے ملکے مرد کامل ہوویگا — ورنہ مطلق فرد باطل ہوویگا
سالکوں سے ہے سخن یہ مجھکو یاد — سچ کہا ہے حرص کا دامن کشاد
سالکوں میں کون وہ پیغمبراں — حکم سے جو حق کے کرتے ہیں بیاں
انکی جا پر وہ جو ہوگا مستقیم — بخشدیگا سب گنہ اسکے کریم
پیروی میں انکی رہ تابوت ہو — فتح پا جالوت پر طالوت ہو
نہرِ دنیا سے زیادہ پی نہ آب — موج کے مانند مت کھا پیچ و تاب
نفسِ بد کو قتل کرائے دیندار — تیرا ہے جالوت تجھ میں برقرار
جہد کر دشمن کو اپنے تو نکال — ورنہ ذلت تجھکو دیگا کمال
بات گر رکھے حسن کی یاد تو — دین و دنیا میں رہے پھر شاد تو
مدعا اس سے نصیحت تھی تمام — اسلئے یہ قصہ لکھا والسلام

آنا دوستونکا خدمت میں ابوالحسن نوری کے

ایک دو صوفی کسی اقلیم سے — بوالحسن نوری کے ملنے کو چلے
جب مسافت کرکے طے پہنچے وہاں — دیکھتے کیا ہیں کہ اک دو بلیاں
بولتی آتی ہیں باہم یک دگر — اپنی بولی میں وہ دونوں شور کر
ناگہاں ان صوفیوں میں ایک تھا — جو زبانِ گربہ سے تھا آشنا
بولی انکی وہ سمجھ کر نیک ذات — کر تاسف اور ملکے دونوں ہات

انا للہ تب وہ کہہ کر رہنموں / بولا پھر انا الیہ راجعون

دوسرا بولا کہ بھائی خیر ہے / کیا یہ تیرے دلمیں آئی غیر ہے

تب کہا اُسنے کہ سُن اے مہرباں / ایک گربہ ایک سے کہتی ہے یاں

یعنے یہ ملنے کو جس سے نیکذات / جاتی ہیں اُسنے تو پائی اب وفات

سُنکے اُسنے تب تاسف سے کہا / پھر چلیں اب فائدہ جانے سے کیا

پھر تو وہ بولا کہ ہمت کیجئے / خاک کی اُنکی زیارت کیجئے

کہکے یہ حجرے تلک پہنچے جو ہیں / دیکھا اُس عارف کے تئیں آتے وہیں

جیسے تھے ویسے ہی اچھے تندرست / قوت جسمی میں بس چالاک وچست

صوفیوں نے جب یہ دیکھا ماجرا / ملتے ہی اُسنے کہا سب واقعا

یعنے اے حضرت تماشا ہے عجیب / نقل ہے بھلی ایک سن لو یہ غریب

اس کا ہم کو کچھ بتاؤ تم نشاں / اسمیں کیا اسرار تھا اے رمزداں

راہ میں دو بلیاں ہم کو ملیں / کہتی آتی تھیں وہ آپس میں چلیں

یعنے پائی آج نوری نے وفات / ہم جو آئے تو تمھیں پایا حیات

صوفیوں سے سنکے یہ قال و مقال / رو کے اپنے حال پر صاحب کمال

رو کے فرمانے لگے اے مہرباں / مجھسے سُنیئے میرے مرنے کا بیاں

راست کہتی تھیں وہ گربہ شک نہیں / مجھکو بھی مرنے پہ اپنے ہے یقیں

آج میں دنیا کی خاطر اک ذرا / یاد حق سے اپنے جو غافل رہا

مرگ کا سو میرے آوازہ عیاں / کردیا ہے لے زمیں تا آسماں

بات مرنے کی جو پھیلی شش جہات / رفتہ رفتہ گربہ تک پہنچی یہ بات

ہیں اگر جینا تو ہیچ ہے ایک دم / یاد کو حق کے نہ کرتا دِلسے کم

بندگی سے اُسکی جو غافل ہوا / جانیو جیتا وہ مردہ دل ہوا

زندگی بے دوست جاں فرسود نست　　مرگ خاطر غائب از حق بود نست

از خدا غیر از خدا را خواستن　　ظن افزونیست کلی کاستن

میرے مرنیکا اچنبھا کیا ہوا　　جو رہا غافل سو ہے جیتا ہوا

پس عزیزو اُسکو تم سمجھو ذرا　　ماجرا یہ تھا جو میں تم سے کہا

از مکافاتِ عمل غافل مشو　　گندم از گندم بروید جو ز جو

پوچھنا بایزید بسطامی کا طبیب سے دوا گناہ کی اور بتانا اُسکا

ایکدن اکجا پہ گذرے بایزید　　کرتے کرتے کوچۂ عالم کی دید

دیکھا اک کھولے دکاں مردِ طبیب　　بیٹھا ہے رستے میں باشانِ عجیب

سیکڑوں خلقت کھڑی ہے پیش و پس　　غرّہ حکمت پہ یہ رکھتا ہے کہ بس

ہیں جو گردا گرد اُسکے دردمند　　اُنسے کہتا ہے باوازِ بلند

یعنی سب دردوں کی رکھتا ہوں دوا　　میری یہ دوکان ہے دار الشفا

دیکھی اُس جا پر جو یہ گفت و شنید　　یوں لگے کہنے تب اُس سے بایزید

اے طبیبِ دردِ ہر خرد و کلاں　　ہے کوئی دارو گنہ کی بھی یہاں

سنکے وہ یہ بات چپکا ہو گیا　　وہ جو دعویٰ تھا غلط سو کھو گیا

ایک دیوانہ کہیں بیٹھا تھا واں　　وہ لگا کہنے ادھر آ اے میاں

میں گنہ کی تیری رکھتا ہوں دوا　　ایک نسخہ پاس ہے میرے لکھا

لیکن اُس نسخے میں ہیں سب تلخ چیز　　پی نہیں سکتا تو اُس کو اے عزیز

بولے تب اُس سے یہ سنکر بایزید　　تلخ دارو ہی تو ہوتی ہے مفید

لا مجھے تو دے کہ پی جاؤں شتاب　　اُسکے پینے سے شفا پاؤں شتاب

سن کے دیوانے نے تب اُسدم کہا ‌ ‌ ‌ پہلے جا تو بیخ درویشی کی لا

ساتھ برگِ صبر اُس میں یار کر ‌ ‌ ‌ اور ہلیلہ علم کا تیار کر

لے ہلیلہ علم کا اے بایزید ‌ ‌ ‌ آطے میں کر تواضع کی مزید

دستۂ توفیق سے گھوٹ اُسکو تو ‌ ‌ ‌ دیگ میں کر پھر تفکر کے فرو

پھر اُسے آبِ محبت سے عزیز ‌ ‌ ‌ آتشِ شوق اُسمیں دے پھر تیز تیز

جوش میں جب آوے تب کیا کار کر ‌ ‌ ‌ ساغرِ اُمید میں تو اُسکو بھر

حلق میں پھر تو گنہ کے اُسکو ڈال ‌ ‌ ‌ تا شفا دیوے حکیمِ ذوالجلال

جو کہ ہو بیمار اُس کا بایزید ‌ ‌ ‌ اُس کے حق میں یہ دوا بس ہے مفید

دے حسنؔ کو بھی الٰہی یہ دوا ‌ ‌ ‌ اس مرض سے تا کہ ہو اُسکو شفا

تمّت